بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

اسلام کی آمد یا پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا تباہی وبربادی کے دہانے پر پہنچ چکی تھی، صرف کفر وشرک کا ہی دور دورہ نہیں تھا، ظلم وجبر، غلامی ومحکومی، قتل وغارت گری، رہزنی وفساد انگیزی، شراب خواری وعصمت دری، غرض برائی وانسانیت سوزی کی کوئی ایسی قسم نہیں تھی، جس کی دلدل میں انسانیت پھنسی ہوئی نہ ہو، عرب ہو یا غیر عرب ہر جگہ کا حال یکساں تھا، اور پوری انسانی دنیا پر ایک ہی طاقت کی حکمرانی تھی اور وہ تھی شر وفساد کی طاقت۔ ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا جو ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس تاریک دور میں رحمت خداوندی جوش میں آئی، اور اس نے انسانیت کی نجات اور ابدی ودائمی فلاح وکامرانی کے لیے اپنے ایک ایسے بندے کو نبی ورسول اور مصلح یکتا بنا کر بھیجا، جس نے چند برسوں کی مختصر سی مدت میں پوری دنیا کی کایا پلٹ دی، ۲۳ر برس کی مدت قوموں کی زندگی میں چشم زدن سے زیادہ نہیں ہے، لیکن اس قلیل عرصے میں اس محسن اعظم کی نبوی تعلیمات نے دنیا کا نقشہ بدل دیا، کہاں تو اس کے آنے سے پہلے تک کفر وشرک، ظلم وجبر اور قتل وغارت کی باد سموم چل رہی تھی، اور کہاں ایمان واسلام، عدل وانصاف اور امن وامان کی خوشبوؤں کو نسیم صبح کے جھونکوں نے دنیا کے ایک ایک حصے تک پھیلا دیا، کہاں تو یہ حال تھا کہ انسانیت شرمسار اور سر بہ گریباں! تہذیب ومعاشرت کا نام ونشان تک نہیں! اور کہاں اب ایسا مقدس وپاکیزہ معاشرہ، اور انسانیت کی ایسی خوبصورت تصویر، جس کو چشم فلک نے نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا اور نہ آئندہ کبھی دیکھ سکتی ہے۔ یہ کرشمہ تھا اس تعلیم کا جو سراپا رحمت ہے، سراپا عدل وانصاف ہے، سراپا عزت وسربلندی ہے، جو شروع سے لے کر آخر تک خیر ہی خیر ہے، ایسی تعلیم اور ایسا دستور العلم جس میں کہیں کوئی کمی، کوئی نقص اور کوئی رخنہ نہیں، اور جب تک اس کے ماننے والوں نے اس نبی رحمت کی لائی ہوئی کتاب اور اس کی دی ہوئی تعلیم اور درس حیات کو اپنا دستور

العلم سمجھا، انھوں نے دنیا پر حکمرانی کی، ان کا اقبال بلند رہا، عزت وسربلندی نے ان کے قدم چومے، لیکن جب اس دین کے ماننے والوں نے اس کی تعلیم سے صرف نظر کیا، تو عزت وعظمت اور اقبال مندی نے بھی اپنا منھ پھیر لیا۔ اب نہ عزت ہے، نہ عظمت ہے، نہ شوکت وقوت ہے، جو تھا سب خاک میں مل چکا ہے، اور رسول رحمت کی تعلیم سے مسلمانوں کی دوری کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دنیا کی حالت تقریباً وہی ہوتی جارہی ہے، جو اس وقت کا نقشہ تھا جب وہ دین رحمت سے روشناس نہیں ہوئی تھی۔

خیر کی کوئی ایسی قسم نہیں ہے جس کا اسلام نے درس نہ دے دیا ہو، اور شر وفساد کی کوئی ایسی قسم نہیں ہے جس پر اسلام نے قدغن نہ لگادی ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد ہی اخلاق وکردار کی بلندی اور اس کی تکمیل کو قرار دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: **اِنَّما بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الأَخْلاقِ** (میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ اچھے اخلاق کی تکمیل کروں) ایک دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: **وَإِنَّمَا بُعِثْتُ عَلَى تَمَامِ مَحَاسِنِ الأَخْلاقِ،** اور ایک جگہ یہ الفاظ ہیں: **اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِي بِتَمَامِ مَحَاسِنِ الأَخْلاقِ، وَكَمَالِ مَحَاسِنِ الْأَفْعَالِ.** ان تمام روایتوں کا خلاصہ یہی ہے کہ مجھے ہر قسم کے عمدہ اخلاق، بلند کردار، اچھے عادات واطوار اور بہترین اعمال وافعال کے ساتھ اور ان کی تعلیم وتلقین کے لیے نبی ورسول بنا کر بھیجا گیا ہے، درحقیقت:

صورت تری معیار کمالات بنا کر
دانستہ مصور نے قلم توڑ دیا ہے

جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ واوصاف حمیدہ میں سب سے نمایاں وصف جس کو آپ کا طغرائے امتیاز کہنا چاہئے رحم وکرم اور عفو ودرگزر رہے، یہ وصف آپ کی ذات ستودہ صفات اور بلند پایہ تعلیمات کا عنوان اور سرنامہ ہے، خود آپ کے خالق ومالک نے فرمادیا ہے: ﴿**وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِيْنَ**﴾ [الأنبياء:۱۰۷] (اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے) اور سورۂ آل عمران میں اللہ رب العزت نے فرمایا ہے: ﴿**فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ، وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ، فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ، إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ**﴾ [آل عمران:۱۵۹] (سو کچھ اللہ ہی کی رحمت ہے جو تو نرم دل مل گیا ان کو، اور اگر تو ہوتا

تند خوسخت دل تو متفرق ہوجاتے تیرے پاس سے، سوتو ان کو معاف کر اوران کے واسطے بخشش مانگ اوران سے مشورہ لے کام میں، پھر جب قصد کر چکا تو اس کام کا تو پھر بھروسہ کر اللہ پر، اللہ کی محبت ہے توکل والوں سے)۔

اسلام دین رحمت ہے:

رحمت ایک عربی لفظ ہے، اردو میں جس کا مطلب ہوتا ہے ہمدردی اور مہربانی، مذہب اسلام خود بھی سراپا رحمت ہے، اوراس وصف سے خداوند کریم نے جگہ جگہ اس کو ذکر کیا ہے، مثلاً سورۂ انعام کی آیت نمبر ۱۵۷ کا ایک ٹکڑا ہے: ﴿فَقَدْ جَاءَ كُمْ بَيِّنَةٌ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدىً وَرَحْمَةٌ﴾ (سو آ چکی تمھارے پاس حجت تمھارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت)۔

سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۵۲ میں مذکور ہے: ﴿وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُـدىً وَرَحْـمَةً لِـقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ﴾ (اور ہم نے ان لوگوں کے پاس پہنچا دی ہے کتاب جس کو مفصل بیان کیا ہے ہم نے خبرداری سے، راہ دکھانے والی اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے)

سورۂ نحل کی آیت نمبر ۸۹ کا ایک حصہ یہ ہے: ﴿وَنَـزَّلْـنَـا عَـلَـيْـكَ الْـكِتٰبَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْـئٍ وَّهُدىً وَّرَحْمَةً وَّبُشْرىٰ لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ (اور اتاری ہم نے تجھ پر کتاب کھلا بیان ہر چیز کا اور ہدایت اور رحمت اور خوشخبری حکم ماننے والوں کے لیے)

سورۂ اسراء کی آیت نمبر ۸۲ کا مضمون تو نہایت مشہور ومعروف اور زبان زد خلائق ہے کہ ﴿وَنُـنَـزِّلُ مِـنَ الْـقُـرْآنِ مَـا هُـوَ شِـفَـاءٌ وَرَحْـمَـةٌ لِـلْـمُـؤْمِـنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ إِلَّا خَسَـارًا﴾ (اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے اور گناہ گاروں کو تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے)

سورۂ نمل کی آیت نمبر ۷۷ میں ہے: ﴿وَإِنَّـهٗ لَهُـدىً وَّرَحْـمَةٌ لِـلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (اور بے شک وہ ہدایت ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے واسطے)۔

سورۂ لقمان کی ابتدا ہی رحمت کے مضمون سے ہوتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ﴿الٓـمّٓ تِـلْـكَ آيٰتُ الْـكِتٰبِ الْـحَكِيْمِ هُدىً وَّرَحْمَةً لِلْمُحْسِنِيْنَ﴾ (الم یہ آیتیں ایک پُر حکمت کتاب کی ہیں، جو کہ ہدایت اور رحمت ہے نیک کاروں کے لیے)

یہ چند آیتیں بطور نمونہ کے پیش کی گئی ہیں، ورنہ بے شمار آیتوں میں اس دین اور اس کی کتاب ہدایت کو رحمت کے لقب سے یاد کیا گیا ہے، جس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دین اسلام کی پوری تعلیم ہی ہدایت ورحمت پر مبنی اور مشتمل ہے۔

اس کے علاوہ خداوند قدوس نے اپنی تمام صفات میں سے صفت رحمت کے ساتھ اپنے کو بے شمار بار ذکر کیا ہے، رحمٰن ورحیم کا لفظ قرآن کریم میں اتنی بار آیا ہے کہ اس کو شمار کرنا مشکل ہے، سورۂ فاتحہ جوام الکتاب اور پورے قرآن کریم کا مغز اور خلاصہ ہے، اور ایک مسلمان شب وروز میں کئی بار اس کو پڑھتا ہے، اس میں خصوصیت کے ساتھ پروردگار عالم کی ان ہی دونوں صفتوں کا ذکر ہے، جس میں پہلی صفت رحمٰن میں رحیم سے بھی زیادہ مبالغہ ہے۔ مسلمان آدمی دن بھر میں بے شمار بار اور ہر کام شروع کرتے وقت **بسم اللہ الرحمن الرحیم** پڑھتا ہے، اس میں اللہ رب العزت کی صفت رحمت کے علاوہ اور کون سی صفت ہے جس کا ذکر ہے۔ خداوند رحیم وکریم کی رحمت عام کا یہ حال ہے کہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رحمۃ للعالمین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَمَّا قَضَى اللّٰهُ الْخَلْقَ كَتَبَ فِي كِتَابِهٖ، فَهُوَ عِنْدَهٗ فَوْقَ الْعَرْشِ: اِنَّ رَحْمَتِيْ غَلَبَتْ غَضَبِيْ. یعنی جب اللہ رب العزت نے مخلوقات کو پیدا کرنے کا فیصلہ فرمایا تو لوح محفوظ میں لکھا جو عرش کے اوپر اس کے پاس ہے کہ: میری رحمت میرے غصہ پر غالب آ گئی۔

دین رحمت میں رحم کی تعلیم:

اسلام نے رحم اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی کے برتاؤ پر بہت زور دیا ہے، انسان تو انسان جانوروں کے ساتھ بھی ہمدردی ومہربانی سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے۔ قرآن کریم کی سورۂ بلد میں مختلف اوصاف حمیدہ کو ذکر کرنے کے بعد مومنین کے اوصاف میں سے اس وصف کو اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور فرمایا گیا ہے کہ ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ [بلد: ۱۷] (پھر وہ ان میں سے ہو جو ایمان لائے اور انھوں نے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت اور رحم کرنے کی وصیت کی)

اور احادیث نبویہ میں تو مختلف پیرایۂ بیان سے نہایت اہتمام اور تاکید کے ساتھ اس کی تعلیم دی گئی ہے، ایک حدیث میں ہے: اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ، اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ

يَرْحَمُكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ (یعنی رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے، زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا)۔

ترمذی شریف ہی میں آنحضرت ﷺ کی ایک دوسری حدیث میں ہے: مَنْ لا يَرْحَمُ النَّاسَ لَا يَرْحَمُهُ اللّٰهُ (جو لوگوں کے ساتھ رحم نہیں کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں کرے گا)۔

بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ: وَإِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ (یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے صرف ان ہی پر رحم کرتا ہے جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں)۔

ترمذی شریف کی ایک اور حدیث میں ہے: لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ إِلَّا مِنْ شَقِيٍّ (یعنی جو بدبخت ہوتا ہے اس کے دل سے جذبۂ رحمت نکال لیا جاتا ہے)۔

ایک حدیث میں ہے: مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا، وَيَعْرِفْ حَقَّ كَبِيرَنَا، فَلَيْسَ مِنَّا (الأدب المفرد) (یعنی جو چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کا حق نہ پہچانے، وہ ہم میں سے نہیں ہے) یعنی وہ مسلمانوں میں سے شمار کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔

احادیث کے ذخیرے میں سے یہ چند حدیثیں صرف نمونہ کے طور پر ہیں، نہ صرف انسانوں بلکہ دوسرے جانداروں کے ساتھ بھی رحمت وشفقت اور مہربانی کی تعلیم اسلامی تعلیمات کا ایک اہم حصہ ہے، جو حدیث وسیرت کی کتابوں میں نہایت وضاحت کے ساتھ مذکور ہے، اور اس کے متعلق مختلف واقعات کے ذریعہ اس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے، جن کے ذکر سے ہماری یہ گفتگو بہت طویل ہو جائے گی۔

اور سرور دو جہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو پوری زندگی ہی رحم وکرم اور عفو ودرگزر سے عبارت ہے، ایک دو نہیں بے شمار واقعات ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے آپ کا سخت ترین دشمن مغلوب ہو کر سامنے آیا، جس سے آپؐ اس کی دشمنی اور ایذارسانی کا بدلہ وانتقام لینے پر قادر تھے، مگر آپؐ نے رحم ومروت سے کام لے کر عفو ودرگزر کا معاملہ کیا، نہایت مشہور واقعہ ہے کہ ایک سفر سے واپسی کے موقع پر آپ ﷺ دوپہر کی سخت دھوپ میں ایک درخت کے نیچے آرام فرما تھے، اور آپ کی تلوار درخت سے لٹکی ہوئی تھی، ایک بدو آدمی نے آپ کو نیند میں دیکھ کر تلوار اٹھائی، اس کی آہٹ پا کر آپؐ نیند سے بیدار ہوئے، اس شخص نے کھلی تلوار لہراتے ہوئے آپؐ سے پوچھا مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّي؟ (آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟) آپؐ نے نہایت سکون سے جواب دیا: اللہ۔ اس کے بعد ایک روایت میں ہے کہ

اس نے تلوار نیام میں کر لی، اور دوسری روایت میں ہے کہ اس پر ایک کپکپی طاری ہوئی اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی، اس کے بعد وہ تلوار آنحضرت ﷺ کے دست مبارک میں تھی، اور دشمن سامنے، لیکن آپ نے اس سے ذرا بھی تعرض نہیں کیا اور درگزر کر دیا، وہ شخص جب اپنے آدمیوں کے پاس آیا تو کہا جِئتُکُم مِنْ عِنْدِ خَیْرِ النَّاسِ (میں سب سے اچھے آدمی کے پاس سے اس وقت آیا ہوں)۔

مکہ کی زندگی میں کفار مکہ کی ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر اور ان سے مایوس ہو کر جب طائف کے لوگوں سے امیدیں وابستہ کر کے وہاں پہنچے ہیں، تو طائف والوں نے آپ کو جو اذیتیں پہنچائیں اور جس قساوت قلبی کا مظاہرہ کیا، اس کو پڑھ کر آج بھی کلیجہ منھ کو آجاتا ہے، لیکن اس وقت بھی آپ ان کو بددعا دینے کے بجائے خدا کے سامنے دست بدعا ہو کر اپنی ہی کمزوری و کم ہمتی کا عذر بیان فرماتے ہیں۔

فتح مکہ کے موقع پر بڑے بڑے اقراری مجرم آپ کے سامنے تھے، مکہ کے وہ تمام لوگ جو پوری زندگی درپئے آزار رہے، جنھوں نے نہ صرف مکہ چھوڑنے پر مجبور کیا، بلکہ مدینہ میں بھی سکون سے نہیں رہنے دیا، گردنیں جھکائے کھڑے ہیں، لیکن آپ نے رحمت عام سے کام لے کر ایک ایک کی جان بخشی کی، رحم و کرم کا وہ منظر ہے جس کی کوئی مثال نہیں ہے۔

....

یہ وہ موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، اور بہت لکھا بھی گیا ہے، ہمارے ان معروضات کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ دین و مذہب جس کے اندر رحم و کرم، عفو و درگزر، مروت و ہمدردی، غم خواری و غم گساری جیسے اوصاف کی اتنی اہمیت کے ساتھ تعلیم دی گئی ہو، اور محاسن و مکارم اخلاق جس کی بنیادی تعلیمات میں شامل ہوں، اس مذہب میں ظلم و ستم، قتل و خونریزی اور ایذا رسانی کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے۔ قتل و غارت اور جان و مال کی بے حرمتی کو اسلام نے نہایت سختی سے حرام قرار دیا ہے، اور اس کے ارتکاب کرنے والے کے لیے سخت سے سخت سزا مقرر کی ہے، حقوق انسانی کا اسلام جیسا علم بردار کوئی مذہب نہیں ہے، اسلام نے انسانی حقوق کے تحفظ کی جو تعلیم دی ہے، وہ تعلیم نہ دوسرے کسی مذہب میں مل سکتی ہے اور نہ دنیا کے کسی قانون میں۔ اسلام حقوق کے پامال کرنے کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ ان کے تحفظ کی تعلیم دیتا ہے، اس سلسلے میں اسلام کی تعلیم نہایت واضح اور صاف ہے، لیکن طوالت کے اندیشہ سے یہاں ان کے ذکر کی گنجائش نہیں ہے۔

اس لیے جو لوگ اسلام کا نام لے کر کمزوروں اور بےقصوروں کو قتل کرتے ہیں، عورتوں اور بچوں کا بے دریغ خون بہاتے ہیں، ہم کو یقین نہیں آتا کہ وہ مسلمان ہو سکتے ہیں، ہم کو کامل یقین ہے کہ قتل وخونریزی کی یہ ساری کارروائیاں ان سازشوں کا حصہ ہیں، جو اسلام کو بدنام اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے عالمی پیمانے پر شب وروز کی جارہی ہیں؛ اور اگر بالفرض وہ مسلمان ہی ہیں، تو اپنی ظالمانہ حرکتوں سے نہ صرف اپنی عاقبت برباد کررہے ہیں، بلکہ اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچارہے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۱۶ کا بقیہ

اور ''آگ''، تو وہ ہوا ہی ہے جو سخت حرکت کی وجہ سے یا سورج کی تاثیر سے سلگ گئی ہے اور اس نے اپنی ایک خاص شکل وصورت بھی اختیار کرلی ہے، ورنہ اس کا کوئی مستقل مرکز نہیں، اس کا کام کچی چیزوں کو پکادینا اور بےکار چیزوں کو جلادینا ہے۔

فلاسفۂ قدیم کا یہ خیال کہ کُرہ ناریہ اور کرۂ ہوائیہ نے زمین وپانی کے کروں کو گھیرا ہوا ہے (یعنی پانی کے کرے کے چاروں طرف سے یکے بعد دیگرے ان دونوں کروں نے گھیر رکھا ہے جس طرح پانی کے کرے نے زمین کے کرے کو گھیر رکھا ہے) یہ محض بے دلیل بات ہے، یہ ایسی ہی بے اصل بات ہے جیسے وہ آسمان وستاروں کا خرق والتیام محال سمجھتے ہیں۔

انفطار کی وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کا نام انفطار اس لیے رکھا ہے کہ اس میں آسمان کے انفطار یعنی پھٹنے کا ذکر ہے جو کہ بہت عمدہ سبب ہے نفوس وعقولِ سماوی کے انسانی نفوس وعقول کے ساتھ مل جانے کا اور درحقیقت اسی ملاپ وتعلق کی وجہ سے ''ما قدمت وما أخرت'' کا علم حاصل ہوگا اور اس سورت میں اسی کا بیان مقصود ہے۔ واللہ اعلم

تمت المقدمة والحمد لله.

ماخوذ:ازتفسیرعزیزی (مسلسل)

مقدمہ سورۂ انفطار

یہ مکی سورہ ہے،اس میں انتیس (۲۹) آیات،اور تین سوانتیس (۳۲۹) حروف ہیں۔

سورۂ تکویر کے ساتھ ربط:

اس سورت کا ربط سورۂ تکویر کے ساتھ اتنا واضح ہے کہ بیان کی ضرورت ہی نہیں۔ بلاتشبیہ اس سورت کو سورۂ تکویر کا دوسرا مصرعہ کہنا چاہئے، یہ ایک جان دو قالب ہیں۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب دونوں ایک ہی ہیں تو ان کو علیحدہ علیحدہ کیوں نازل کیا، ایک ہی سورت بنا کر نازل کر دیتے؟

سواس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں میں قیامت کے ابتدائی حادثات کا بیان کرنا مقصود ہے، کہ کس طرح سے یہ کائنات فنا و برباد ہوگی اور ایک دوسرا عالم وجود میں آئے گا، جہاں پر انسان کی قوتِ علمیہ یعنی اس کی سمجھ بوجھ عقل وشعور کمال کی بلندی تک پہنچ جائے گی، اور اس کی قوتِ عملیہ یعنی کام کرنے کی صلاحیت قوتِ خیالیہ کے ملنے اور دیگر اسباب ومواد کی طاقت حاصل ہوجانے کی وجہ سے رب العالمین کی قدرت کی طرح (بلاتشبیہ) ہوجائے گی کہ جس طرح اللہ کی قدرت یہ ہے کہ وہ ایک لمحے میں ''کن'' کے اشارے سے تمام کاموں کو انجام دے دیتا ہے، اسی طرح اس عالم آخرت میں جنتی انسان کو قدرت عطا ہوگی، اور وہاں انسان کی خلافت صحیح معنوں میں کھلے طور پر نظر آئے گی، یعنی اللہ کا نائب وخلیفہ ہونے کی واضح شکل وہاں نظر آئے گی۔

دونوں سورتوں کے درمیان فرق:

دونوں سورتوں کے مضامین میں اس اتحاد کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان فرق بھی ہے اور فرق کی وجوہات حسب ذیل ہیں:

۱:-سورۂ انفطار میں اس کائنات کے اصول کی فنا و بربادی کی کیفیت بیان فرمائی ہے، اور سورۂ تکویر میں اس کائنات کے تمام اصول وفروع کی خرابی وتباہی کی کیفیت کے ساتھ دوسرے جہان

میں دومنزلوں یعنی جنت وجہنم کی تعمیر کو بھی بیان فرمایا ہے۔

۲:-سورۂ انفطار میں ان تمام کاموں پر انسان کے احاطۂ علمی کو بیان فرمایا جو دنیا میں اس سے صادر ہوئے، یعنی ان سب افعال وتروک کا علم اس کو قیامت کے دن حاصل ہو جائے گا(۱)۔

اور تکویر میں اس چیز پر انسان کا احاطۂ علمی بیان فرمایا جو قیامت کے دن اس کو فی الوقت کام آئے گی (۲)، یعنی وہ حیاتِ وحدانیہ جو افعال وتروکِ کثیرہ سے ممتزج ہے اور وہ افعال وتروک اس زندگی کے جوہرِ نفس کو لازم ہو چکے ہیں۔(اس پوری کیفیت کا اس کو علم ہو جائے گا)

۳:- سورۂ انفطار میں حوادث قیامت کے بیان کے ساتھ ساتھ اس ضمن میں قیامت کی جزا وسزا کو بیان کیا اور اس کے منکرین کے اعتقاد باطل کی تردید کی طرف توجہ مبذول فرمائی ہے۔

اور سورۂ تکویر میں اس بیانِ مذکور کے ساتھ ساتھ رسالت اور قرآن کی حقانیت کا اثبات کیا اور ان دونوں باتوں کے منکرین پر رد بھی کیا ہے۔ یہ بیان دونوں سورتوں میں مختلف وجوہات کا لحاظ کیا گیا ہے، اسی اختلاف کی وجہ سے ان دونوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ نازل فرمایا ہے۔

(یہ درمیان میں دونوں سورتوں کے اختلاف کی وجوہات تھیں، ابتداء کلام سے یہاں تک جو بات اجمالی طور پر بیان ہوئی ہے اب اس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے جو مقدمہ کے اختتام تک جائے گی)

دنیا کے فنا ہونے اور عالم آخرت کے وجود میں آنے کی حسی مثال:

اس سے پہلے جو اجمالی بیان ہوا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کسی چیز کو خراب کر کے اور توڑ پھوڑ کر اسی جیسی چیز دوسری جگہ بنانا چاہتے ہیں، تو دستور یہ ہے کہ اس چیز کو جڑ اور بنیاد سے کھودتے ہیں، پھر اس کے ساز وسامان میں سے حسب ضرورت تھوڑا بہت دوسری جگہ لے جاتے ہیں اور سابقہ شکل وصورت میں تبدیلی کر کے نئی چیز بناتے ہیں، تاکہ جو کام اس نئی جگہ انجام دیتے ہیں وہ اسی نئی صورت میں انجام دیے جائیں، جیسے جب کسی حویلی کو باغ بناتے ہیں یا باغ کو حویلی، یا مقبرہ، یا خالی زمین پر حویلی یا کھیتی بنانا چاہتے ہیں تو اسی قسم کا معاملہ کرتے ہیں، اس تمہیدی مثال کے بعد اب تفصیل سمجھئے:

(۱) یہ بات اس آیت میں بیان ہوئی "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ"
(۲) اشارہ ہے سورۂ تکویر کی اس آیت کی طرف "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ"

خلافت، انسان کا مقصدِ تخلیق:

دنیا کا عالم بھی ایک بنائی ہوئی چیز ہے اور یہ جگہ انسانوں کے ہمیشہ رہنے کی نہیں ہے، بلکہ انسان کو یہاں اس لیے لائے کہ وہ یہاں رہ کر اپنے اندر کمال پیدا کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کی اہلیت ولیاقت اس میں پیدا ہوجائے اور عالمِ آخرت کو علم وعمل کی وسعتوں کے ساتھ آباد کرسکے، چنانچہ سب سے پہلے انسان کو جسم اور روح دو چیزوں سے ملا کر پیدا کیا، روح آسمانی چیز ہے، اس کی غذا آسمان سے اترتی ہے، اور جسم زمینی چیز ہے اس کی غذا زمین سے پیدا ہوتی ہے۔

پھر کاروبارِ خلافت کا خوگر بنانے کے لیے انسان کو زمین وآسمان دونوں کی چیزوں کے اندر تصرف کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی، تاکہ چیزوں کے جمع کرنے، جوڑنے اور ملانے کا سلیقہ اپنے اندر پیدا کرکے خلافتِ کبریٰ کا لائق ہوسکے، یہی وجہ ہے کہ انسان زمین کی تمام چیزوں کو خواہ وہ کھانے پینے کی ہوں، یا دوسری مثلاً پتھر، گھاس، درخت، چشمے، نہریں، جانور اور پرندے وغیرہ سب کو اپنے کام میں لانے کے لیے مشغول رہتا ہے اور چیزوں کی جمع تالیف میں مصروف رہتا ہے، اسی محنت کے نتیجے میں وہ عجیب وغریب صنعتیں، اور فن پاروں کی ایجاد کرتا رہتا ہے، نئے نئے کھانے، نئے نئے لباس، سواریوں اور گھروں کے نئے نئے نمونے اور ہر طرح کی چیزیں جو مختلف خاصیتیں اور تاثیریں رکھتی ہیں ان کی ایجاد کرتا ہے، گویا اس میں وہ خالق الأصول والفروع جل جلالہٗ کے ساتھ ایک گونہ مشابہت اختیار کرلیتا ہے۔

اسی طرح آسمانی مخلوقات جن میں ستارے ہیں، سیارے ہیں اور بڑے عالی رتبہ فرشتے ہیں، ان کے ذریعہ سے اپنے کام نکالتا ہے اور آسمان کی بلندیوں سے کوسوں دور زمین پر بیٹھ کر وہ آسمان کی مخلوق کی تسخیر کے طریقے جانتا ہے۔

خلافت کے اعتبار سے انسانوں کی دو قسمیں اور عالمِ آخرت کی ضرورت:

لیکن بعض انسان بہت نقصان وگھاٹے میں پڑ گئے کہ تصرف کی جو صلاحیت اللہ تعالیٰ نے ان کو ملکۂ خلافت پیدا کرنے کے لیے عطا کی تھی، انھوں نے اس سے غلط فائدہ اٹھایا اور بے جا تصرف کرنے لگے، جو کام کرنے کے تھے وہ تو چھوڑ دیے، اور جو نہیں کرنے تھے وہ کیے، آخر کار وہ خلافت کا منصب ومقام تو کجا، بندگی کے مقام سے بھی نیچے گر گئے، چنانچہ سزا وعذاب کے مستحق ٹھہرے۔

اسی لیے عالمِ آخرت کو جزاء وسزا کے لیے مقرر فرمایا تا کہ وہاں نیک و برے دونوں طرح کے انسانوں کے درمیان فرق وامتیاز کیا جاسکے، اوران فرمانبرداروں کو جنھوں نے صحیح جد و جہد کر کے اپنے اندر خلافتِ کبریٰ کی صلاحیت وملکہ پیدا کیا تھا ان کی یہ خلافتِ کبریٰ کی لیاقت وصلاحیت پوری وسعت وکشادگی اور دوام وہیشگی کی صفت کے ساتھ ظہور پذیر ہو، اور جنھوں نے سرکشی، نافرمانی اور اپنے آقا سے دوری کو اس طرح اپنایا کہ وہ سرکشی ونافرمانی ان کے مزاج میں رچ بس گئی اوران کا ملکہ بن گئی، پھر یہ ملکہ عالم آخرت میں جا کراوجِ کمال تک پہنچ گیا تا کہ وہ اپنے ان بدترین اعمال کے نتیجے میں ہمیشہ کے عذاب میں گرفتار ہوسکیں۔

آخرت میں مؤمن کی بے پناہ قدرت وقوت کا راز:

پھراسی کام کے لیے یعنی انسان کی صلاحیت وملکہ کوہیشگی کے ساتھ لامحدودطور پر بڑھادینے اور وسعت دے دینے کے لیے عالمِ آخرت میں یہ ضروری ہوا کہ تمام اجسام وارواح کوانسان کی خدمت وتابعداری میں لگادیا جائے، اس لیے کہ یہ ضعیف وکمزورانسان نہ تواس کے جسمانی ڈھانچے میں دوام وہیشگی کی طاقت ہےاور نہ اس کی روح غیر معمولی بڑے کام ہیشگی کے ساتھ کرسکتی ہے، لہٰذا یہ قرار پایا کہ تمام آسمانی ارواح اس کی روح کی مددگار بنیں اور تمام قوائے عقلیہ وخیالیہ اس کی قوتِ عقلیہ وخیالیہ کے اندر آکر پیوست ہوجائیں، اور زمین کے تمام مواد جواس کے جسم اوراس کے متعلقات کے لیے تقویت کا ذریعہ ہوں، متعلقات سے مراد جسم کی ضروریات وحوائج ہیں جیسے لباس کھانے پینے، رہنے سہنے اور پاکی وغیرہ کی چیزیں ہیں، بلکہ سانپ وبچھو، طوق وزنجیراورآگ وشعلے بھی اس کے مددگاراوراسی کے کام میں مصروف ہوجائیں، تا کہ فرمانبرداروں کی خلافت کا معنی بہترین صورت میں جلوہ گرہواور باغیوں، سرکشوں کی بغاوت وسرکشی بھی صحیح صورت میں ظاہر ہو۔[1]

(۱) اجسام وارواح کا انسان کی مدد یا خدمت وتابعداری کرنے سے معروف معنی مرادنہیں ہیں، بلکہ حضرت شیخ قدس سرہ کی مراد واللہ اعلم یہ ہے: کہ روح درحقیقت ایک لطیف اورنورانی قوت کا نام ہے، لہٰذا آسمانی ارواح جونورانی قوتیں ہیں وہ انسانی روح کی مددگار بنیں گی، اس طرح اس ایک روح کی طاقت وقوت کئی ارواح کی قوت کے برابر ہوجائے گی، یہی حال قوت عقلیہ وخیالیہ کا ہے۔

اسی طرح انسانی جسم جوکہ مادے سے بنا ہے، اس کو لامحدود قوت اس طرح حاصل ہوگی کہ زمین کے تمام مواد کی قوتیں اس کے اندر سرایت کرجائیں گی، اس طرح اس ایک جسم کی طاقت وقوت بے شمار اجسام کی طاقت کے برابر ہوجائے گی، اگرچہ یہ مادی قوتیں عالمِ دنیا میں مختلف صورِ شخصیہ رکھتی تھیں مثلاً سانپ، بچھو، زنجیر وسلاسل وغیرہ یہ سب مادے کی صور=

اس سورت میں چار انقلاب بیان فرمائے ہیں اور ان چاروں کا تعلق اس عالم کے اصول کے ساتھ ہے۔

پہلا انقلاب:

پہلا انقلاب آسمان کا پھٹنا ہے، آسمان کے پھٹ جانے سے آسمانی عقول ونفوس کا تعلق اپنے اجرام سے ختم ہو جائے گا، یعنی وہ آسمانی اجسام جن کے ساتھ ان عقول ونفوس کا تعلق تھا ان کا یہ تعلق ان اجسام سے منقطع ہو جائے گا، اوران کا تعلق اس وقت انسانی نفوس کے ساتھ قائم ہو جائے گا۔

شریعت نے اسی مقصد کو اس طرح تعبیر کیا ہے کہ اس دن ساتوں آسمان کے فرشتے اتریں گے، انسانوں کے اردگرد جمع ہو جائیں گے اور انسانی ارواح کے بہت قریب ہو جائیں گے۔

جب ان نفوس سماوی کا تعلق، نفوس انسانی کے ساتھ قائم ہوگا، تو ہر انسان کے فہم وادراک، سمجھ بوجھ اور فکر وشعور کی قوت میں ایک عظیم بشاشت ووسعت پیدا ہوگی، اور اسی کے نتیجے میں انسان سے دنیا میں خیر وشر کے جو اعمال سرزد ہوئے ہوں گے، ان سب کی حقیقت واشگاف طریقے سے کھل کر اس کے سامنے آجائے گی۔

دوسرا انقلاب:

دوسرا انقلاب یہ کہ آسمان کے سب ستارے ٹوٹ کر گر جائیں گے، اور وہ نورانی ارواح جن کا تعلق ان ستاروں کے ساتھ تھا وہ انسانی بدن کے ساتھ متعلق ہو جائیں گی، لیکن اس تعلق میں اس مناسبت کا لحاظ ہوگا جو دنیا میں رہتے ہوئے انسانی افراد کو ان ارواح سے حاصل ہوئی تھی، یا پیدائشی طور پر اللہ تعالیٰ نے وہ مناسبت کسی کو جتنی عطا فرمائی تھی، اسی مناسبت کی بقدر آج ان ارواح کا تعلق انسانوں سے قائم ہوگا، ان ارواحِ کوکبیہ کے ملنے سے انسانی روح کی قوت میں اضافہ ہوگا۔

اسی مقصد کو قرآن میں ''قیام روح'' اور ''نزول روح'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔(۱)

=نوعیہ شخصیہ تھیں، ان سب کا انسانی جسم کے مددگار ہونے کا یہی معنی ہے اور یہ اللہ کی قدرت سے ہوگا، واللہ اعلم بالصواب۔
یہ پوری بحث بندہ نے انتہائی فکر وکوشش سے آسان اور عام فہم کرنے کے لیے اپنے الفاظ میں ماحصل کے طور پر بیان کی ہے، عین ممکن ہے بندہ حضرت مصنف علام کے مقصد وغرض کو سمجھنے میں کہیں چوک گیا ہو، اس لیے اگر کوئی شبہہ پیدا ہو، تو اصل ''فارسی'' کی طرف مراجعت فرمائی جائے۔۱۲اسفیر احمد

(۱) یوم یقوم الروح والملائکة صفاً

یہ دونوں آسمانی انقلاب ہیں، ان کی وجہ سے انسانی روح کو بہت فرحت وسرور اور خوشی وبشاشت حاصل ہوگی۔

تیسرا انقلاب:

تیسرا انقلاب یہ بیان ہوا کہ سمندر اپنی تمام خلیجوں سمیت جوش مارے گا، تو اس کے پانی کا کچھ حصہ بخارات ودھواں بن جائے گا، کچھ حصہ زمین کے اندر جذب ہوکر زمین میں نمی پیدا کرے گا، تاکہ مٹی آسانی سے صورتوں شکلوں میں ڈھل سکے (وہ شکلیں جو اس کے اندر دفن کی گئیں ہیں اور مٹی میں مل چکی ہیں) اور اس کے پانی کا کچھ حصہ آگ بن کر بھڑک اٹھے گا اور دوزخ کے بھڑکنے کا سبب ہوگا، اسی مقصد کو قرآن میں کہیں ''تفجیر بحار'' سے تعبیر فرمایا ہے اور کبھی ''تسجیر بحار'' کے الفاظ سے بیان فرمایا ہے۔ اور حدیث میں بھی آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمندر کے بارے میں فرمایا ''إنَّ تحته ناراً'' اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب دریائے شور کو دیکھتے تو فرماتے ''یا بحر متی تعود ناراً'' اے سمندر تو آگ میں کب تبدیل ہوگا؟

چوتھا انقلاب:

چوتھا انقلاب زمین کا ہلنا ہے، قرآنِ کریم میں جگہ جگہ اس انقلاب کو ''زلزلة الساعة'' سے تعبیر فرمایا ہے، اور اس کے آثار ونتائج جو اس کے رونما ہونے سے ظاہر ہوں گے، قرآن وحدیث میں مختلف بیان کیے گئے ہیں، چند ایک یہ ہیں، مثلاً ایک نتیجہ اور نشانی تو اسی سورۂ انفطار کی اس آیت میں بیان فرمائی ہے:

''وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ'' یعنی اجزائے بدنیہ گوشت، ہڈیاں، جلد وغیرہ کا جمع ہوکر زمین کے اوپر آجانا۔

اس کی ایک اور نشانی ''تسییر جبال'' ہے یعنی پہاڑوں کا چلنا، انہی میں سے ''اخراجِ اثقال'' ہے یعنی زمین کے اندر چھپے خزائن اور دفن کیے گئے مردوں کا زمین کے اوپر آجانا، انہی میں سے زمین کا ہموار ہوجانا ہے، انہی میں سے زمین کی قوتِ نامیہ کا باطل ہوجانا بھی ہے، زمین کے اس انقلاب کے آثار میں سے وہ بھی ہے جس کا ذکر صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اس دن زمین سفید میدے کی روٹی کی طرح ہوجائے گی اور محشر والوں کے لیے غذا کا کام دے گی، اس کے علاوہ اور بہت سے آثار

ونشانیاں ہیں، سب کو اگر ذکر کیا جائے تو بات لمبی ہوگی۔

یہ دونوں انقلاب (یعنی سمندر کا بھڑکنا اور زمین کا ہلنا) زمینی ہیں، ان کی وجہ سے جسمِ انسانی کا مواد حاصل ہوگا تا کہ یہ اس نفس وسیعہ اور روح کاملہ کی کاریگری کا موضوع یعنی موقوف علیہ بن سکے۔

ان چار انقلابوں کے بعد ایک نئے عالم کی بنیاد رکھی جائے گی جس کو عالمِ آخرت کہتے ہیں، اس عالم کے قیام کی بنیادی اور اصلی وجہ یہ ہے تا کہ اچھے اور برے اعمال کی حقیقت کھل جائے (یعنی دنیا میں نیک عمل یا برے عمل کا نتیجہ اچھا یا برا نظر نہیں آتا کہ کیا ہے وہاں اچھے عمل پر ثواب اور اچھا نتیجہ اور برے عمل کا برا نتیجہ واشگاف طریقے سے کھل کر سامنے آجائے گا) اسی لیے اس سورت میں ان چار انقلابات کے ذکر کے بعد اسی بات کو بیان فرمایا ہے۔

کائنات کے چار بنیادی ارکان:

یہاں صرف چار انقلابوں کے بیان پر ہی اکتفا کی وجہ یہ ہے کہ تحقیق کے بعد یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس عالم کے بنیادی اصول چار ہی چیزیں ہیں (۱) آسمان (۲) ستارے (۳) پانی (۴) زمین

ان کے علاوہ اس کائنات میں باقی جتنی چیزیں ہیں وہ انہی کے اجزاء سے مرکب ہیں ان کا کوئی مستقل الگ مرکز نہیں، جیسے معدنیات، نباتات، جاندار اور زمین وآسمان کے درمیان کی تمام مخلوقات سب عقلا کے نزدیک انہی چاروں سے پیدا ہوتی ہیں۔

کرۂ ناریہ اور کرۂ ہوائیہ کا وجود نہیں:

لیکن کارخانہ عقل کے ظاہر بینوں نے ہوا اور آگ کو مستقل مان لیا، مگر تحقیقی بات یہ ہے کہ ہوا ایک ایسا جسم ہے جو پانی کی لطافت یا بعض ستاروں کی تاثیر سے کم یا زیادہ پیدا ہوتی رہتی ہے، اس کی پیدائش کے لیے مستقل کوئی مرکز جسے دوسرے الفاظ میں کُرہ کہیں نہیں ہے، نہ اس کا بالاستقلال کوئی کُرہ ہے اور نہ یہ کوئی صورت قبول کرتی ہے، اس کا کام صرف چلنا اور مخلوقات کی کیفیات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دینا ہے، جیسے بُو کو ناک میں، آواز کو کان میں، گرمی، سردی، خشکی، تری کو قوتِ لامسہ میں یعنی جاندار کی جلد تک پہنچا دینا ہے، اسی پر دوسری چیزوں کو قیاس کر لیا جائے۔ بقیہ صفحہ ۹ پر

الازہار المربوعہ
(مسلسل)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

مجیب صاحب کو اگر مقابلہ کرانے اور فیصلہ کرنے ہی کا شوق تھا تو ان کو لکھنا چاہئے تھا کہ حدیث بتہ کی امام بخاری نے تعلیل اور ایک مجہول جماعت نے تضعیف کی ہے اور ابوداؤد، ابن حبان اور حاکم وغیرہ نے اس کی تصحیح کی ہے، پس ان کے مقابلہ میں بخاری اور اس مجہول جماعت کا قول کیا وقعت رکھتا ہے، خصوصاً جب کہ بخاری نے بھی اس واقعہ میں لفظ بتہ ہی کے ساتھ طلاق دینے کو واضح کہا ہے۔

باقی رہا یہ کہنا کہ ابن حجر نے خود ہی اپنے اعتراض کا جواب دے دیا ہے، تو یہ صریح غلط بیانی ہے، اگر مجیب سچے ہیں تو کوئی عبارت ابن حجر کی پیش کریں جس میں وھو معلول کہنے کا جواب انھوں نے دیا ہو۔

صاحب آثار نے میرا دوسرا اعتراض یہ لکھا ہے ''حافظ ذہبی نے بھی اس کو داؤد بن الحصین کے مناکیر میں شمار کیا ہے، پس اس حالت میں اگر اس کی اسناد صحیح یا حسن بھی ہو تو استدلال نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ اسناد کی صحت استدلال کی صحت کو مستلزم نہیں ہے'' اور اس اعتراض کے تین جواب دیے ہیں۔

''اول اگر ذہبی نے اس حدیث کو داؤد کے مناکیر میں شمار کیا ہے تو اس کے نیچے ایک اور حدیث بھی لکھی ہے، اور اس حدیث سے حنفیہ نے استدلال کیا ہے، یہ کیا ایمانداری ہے کہ داؤد کے مناکیر میں دونوں ہیں لیکن ایک کو اپنے مذہب کے موافق ہونے سے شیر مادر کی طرح قبول کرلیا جاتا ہے (دیکھو نصب الرایہ) اور دوسرے کو اپنے مذہب کے مخالف ہونے کی وجہ سے .... رد کردیا جاتا ہے'' (آثار ص۲۴ مختصراً)

جواب:— مجیب صاحب! اگر چند غلط سلط باتیں لکھ دینے کا نام جواب ہے تو بہت شوق سے آپ اور آپ کے ہوا خواہ اس جواب کو جواب کہیں، لیکن اہل علم کے نزدیک اس کا نام جواب نہیں

ہوسکتا۔ بے شبہہ ذہبی نے حدیث مسند کے نیچے ایک اور حدیث بھی لکھی ہے اور وہ بھی داؤد کے مناکیر سے ہے۔ اتنا بیان آپ کا درست ہے، لیکن آگے یہ لکھنا کہ ''اس حدیث سے (یعنی حدیث مسند کے بعد والی حدیث سے) حنفیہ نے استدلال کیا ہے'' خالص غلط بیانی ہے، اور اس کے لیے نصب الرایہ کا حوالہ دینا دوسری غلط بیانی ہے۔ اگر مجیب صاحب سچے ہیں تو نصب الرایہ کی وہ عبارت پیش کریں جس سے حنفیہ کا اس حدیث سے استدلال کرنا ثابت ہوتا ہو، مجیب کی اس شرمناک جرأت پر مجھ کو سخت تعجب ہے کہ نصب الرایہ میں تو حافظ زیلعی ابن عبدالبر کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ **هو حديث منسوخ عندالجميع لأنهم لا يجيزون رجوعها إليه بعد خروجها من عدتها** (یعنی یہ حدیث سب کے نزدیک منسوخ ہے اس لیے کہ سب لوگ مسلمان عورت کے رجوع نکاح اول کو اس کے شوہر کے پاس عدت کے بعد ناجائز کہتے ہیں) پس جب یہ حدیث سب کے نزدیک منسوخ ہے تو حنفیہ یا کوئی اور اس سے استدلال کیونکر کرسکتا ہے۔

ہاں مجیب کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ امام طحاوی نے بھی اس حدیث کو منسوخ کہا ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ شوکانی نے سہیلی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ فقہاء میں کوئی بھی اس حدیث کا قائل نہیں ہوا ہے۔

ان حالات میں وہ خود سوچیں کہ حنفیہ اس سے کیوں استدلال کریں گے۔

باقی رہا موافق مذہب حدیث کو شیر مادر سمجھنا اور مخالف کو رد کردینا تو یہ مجیب صاحب اپنے گھر کا قصہ بیان کررہے ہیں مگر ع

گفتہ آید در حدیث دیگراں

کے طور پر۔

صاحب آثار کا دوسرا جواب یہ ہے کہ منکر کا اطلاق منفرد پر ہوتا ہے۔ الخ آثار ص ۴۲

جواب:– اس جواب کی حقیقت مخالفین کی حدیث اول کے ضمن میں بہت اچھی طرح منکشف ہوچکی ہے، یہاں اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

اولاً:– یہ جواب اگر صحیح بھی ہو تو اس کا امکان اس وقت ہے جب ذہبی نے منکر کا لفظ لکھا ہوتا، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، جبکہ ان کی عادت ہے کہ ہر راوی کے ترجمہ میں اس کی ان روایات کو لکھ

جاتے ہیں جن میں نکارت غیر مقبولہ ہوتی ہے، اس حدیث کو بھی انھوں نے اسی طرح لکھا ہے، اسی لیے میں نے یہ لکھا ہے کہ مناکیر میں شمار کیا ہے، یہ نہیں لکھا ہے کہ منکر کہا ہے۔

ثانیاً:– مجیب صاحب نے ص۲۱ میں جس کا یہاں حوالہ دیا ہے، یہ تصریح کردی کہ منفرد پر منکر کا اطلاق قدما کرتے ہیں۔اور متاخرین اس حدیث پر منکر کا اطلاق کرتے ہیں جس کا راوی ضعیف اور ثقات کی مخالفت کیے ہوئے ہو۔اور ظاہر ہے کہ ذہبی متاخرین میں ہیں، لہٰذا مجیب کا یہ جواب بالکل بے محل اور غلط ہے، ہاں اگر ذہبی قدما میں سے ہوتے اور منکر کا لفظ بولے ہوتے تو اس جواب کا ذکر چنداں معیوب نہ ہوتا، لیکن جب ذہبی متاخرین میں ہیں اور قدما و متاخرین کی اصطلاحات کو آپ خود جدا جدا مانتے ہیں تو قدما کی اصطلاح کا یہاں ذکر کرنا نافہمی ہے یا نہیں؟ افسوس ہے کہ مجیب اپنی لکھی ہوئی بات بھی بھول جاتے ہیں۔

ثالثاً:– قدما بھی ہمیشہ منفرد ہی پر منکر کا اطلاق نہیں کرتے، بلکہ حدیث ضعیف مخالف ثقات پر بھی منکر کا اطلاق کرتے ہیں، چنانچہ مجیب نے جو عبارتیں نقل کی ہیں ان میں سے دو عبارتوں میں یہ تصریح موجود ہے کہ ''قدما بہت سی منفرد پر منکر کا اطلاق کرتے ہیں'' یعنی بعض دفعہ اس کے خلاف بھی کرتے ہیں، لہٰذا قدماء کے کلام میں بھی جب تک یہ نہ ثابت کیا جائے کہ ان کی اکثر ہی یہی عادت تھی بلاقرینہ منکر سے منفرد مراد لینا تحکم ہے۔

صاحب آثار کا تیسرا جواب یہ ہے کہ میزان میں ہونے سے یہ کیا ضروری ہے کہ علامہ ذہبی بھی اس کے قائل ہوں (الی) واقعہ یہ ہے کہ یہ ذہبی کا قول نہیں ہے بلکہ ابن المدینی اور ابوداؤد کا ہے، (آثار ص۴۴)

جواب:– مجیب صاحب یا تو سمجھتے ہی نہیں یا سمجھ بوجھ کر خلط مبحث کرنا چاہتے ہیں، بہر حال ذہبی نے ایک تو اپنی عادت کے مطابق حدیث مسند کو داؤد کے مناکیر میں شمار کیا ہے، دوسرے انھوں نے ابن المدینی وابوداؤد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عکرمہ سے جو روایتیں داؤد لاتے ہیں وہ منکر ہوتی ہیں۔ یہ دوسری بات بے شبہہ ابن المدینی وابوداؤد کی ہے، اور اس کو میں نے ذہبی کی طرف کہیں بھی منسوب نہیں کیا ہے۔اب رہی پہلی بات یعنی حدیث مسند احمد کو مناکیر داؤد میں ذکر کرنا تو یہ ذہبی ہی کا فعل ہے اور اس کو ابن المدینی وابوداؤد کا قول کہنا نافہمی بھی ہے اور غلط بیانی بھی، اور جب ذہبی نے

کسی دوسرے مصنف کا حوالہ دیے بغیر خود ہی اس کو اپنی عادت کے مطابق بسلسلۂ مناکیر ذکر کیا اور کوئی لفظ ایسا نہیں لکھا جو ان کے عدم رضا پر دلالت کرے، تو خواہ مخواہ ان کو اس کا قائل مانا جائے گا ورنہ پھر کسی بات کی نسبت کسی مصنف کی طرف جائز نہ ہوگی، اس لیے کہ یہ ہر جگہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مصنف کے ذکر کرنے سے یہ کیا ضرور ہے کہ وہ اس کا قائل بھی ہو۔

تنبیہ:- مجیب نے اپنی اس خوش فہمی کا مظاہرہ ص ۴۵ میں بھی کیا ہے اور مذکورہ بالا دونوں باتوں میں فرق نہ کرتے ہوئے چوتھے اعتراض کو بعینہ دوسرا اعتراض قرار دیا ہے مگر ناظرین نے دیکھ لیا کہ یہ مجیب کی خوش فہمی ہی خوش فہمی ہے۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

یہ سب اس وقت ہے جب کہ حدیث کی اسناد کو صحیح یا حسن تسلیم کر لیا جائے لیکن ابھی اسی میں بہت گفتگو ہے کہ اسناد بھی صحیح ہے یا نہیں (اعلام ص ۱۹)

صاحب آثار لکھتے ہیں:

”آخر آپ کو...... پس و پیش کیوں ہے صاف صاف لکھیے آپ اس کو صحیح الاسناد مانتے ہیں یا نہیں اگر رجال اسناد...... کی وجہ سے یہ حدیث نا قابل احتجاج ہے تو بقول آپ کے حافظ ابن الحجر کا اس کو معلول کہنا غلط ہے اور اگر معلول کہنا صحیح ہے تو ابن اسحاق اور داؤد پر آپ کا جرح کرنا قطعاً لغو ہے آپ کے نزدیک معلول کہنے کے لیے صحیح الاسناد ہونا ضروری ہے (آثار ص ۴۳)

جواب:- مجیب صاحب کی یہ ساری تقریر بناء فاسد علی الفاسد ہے، مجھ کو نہ کوئی پس و پیش ہے نہ تردد۔ بلکہ میں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ مسند والی حدیث...... بخاری کے استاد اور ابوداؤد کے فیصلہ کے مطابق بھی منکر ہے (اعلام ص ۱۹)

اور میری جس عبارت کا یہ ابتدائی فقرہ مجیب نے نقل کیا ہے وہ پوری پڑھیے تو آپ کو اس سے بھی صاف معلوم ہو جائے گا کہ میں اس حدیث کو صحیح الاسناد نہیں مانتا۔ اور اب بھی بلاخوف تردید کہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ حدیث اسناد کے لحاظ سے نا قابل احتجاج ہے، بایں ہمہ حافظ ابن حجر کا اس کو معلول کہنا غلط نہیں ہے، اس لیے کہ کسی حدیث کو معلول کہنے کے لیے میرے نزدیک اس کی سند کا قابل احتجاج ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح ابن حجر کا اس حدیث کو معلول کہنا بالکل صحیح ہے، باوجود

اس کے ابن اسحاق وداؤد پر میرا جرح کرنا کسی طرح لغونہیں، اس لیے کہ میرے نزدیک معلول کہنے کے لیے صحیح الاسناد ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ اور پہلی شق میں ابن حجر کی تغلیط اور دوسری میں اشتراط صحت اسناد کی نسبت میری جانب صریح غلط بیانی ہے۔

مجیب صاحب اعلام کی عبارت پھر پڑھیں اور نہ سمجھ سکیں تو کسی اردوداں سے پوچھ کر سمجھنے کی کوشش کریں، میری عبارت یہ ہے "بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی حدیث کی اسناد بہت ٹھیک ہوتی ہے لیکن اس کے مضمون میں کوئی باریک علت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ نامقبول ہوجاتی ہے، ایسی حدیث کو اصطلاح میں معلول کہتے ہیں" اس عبارت سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ معلول کے لیے صحیح الاسناد ہونا ضروری ہے، بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحیح الاسناد حدیث جس کے مضمون میں کوئی باریک علت ہو اس کا معلول ہونا ضروری ہے، اگر مجیب صاحب سچے ہیں تو ثابت کریں کہ معلول کی صحت اسناد کا ضروری ہونا میری عبارت سے کس طرح ثابت ہوتا ہے۔ اس عبارت میں مصرح ہے کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے۔ یعنی ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ کہ حدیث کی اسناد ٹھیک ہو اور اس کے مضمون میں کوئی باریک علت ہو تو اس کو معلول کہا جائے، بلکہ بعض دفعہ اسناد بھی ٹھیک نہیں ہوتی اور مضمون میں بھی کوئی باریک علت ہوتی ہے اس کو بھی معلول کہتے ہیں۔ منطقی اصطلاح میں یوں سمجھیں کہ میری عبارت ایک قضیۂ جزئیہ ہے جس سے صرف بعض صورتوں میں معلول کا صحیح الاسناد ہونا لازم آئے گا، ہر صورت میں معلول کا صحیح الاسناد ہونا لازم نہ آئے گا، دوسری طرح یوں سمجھیں کہ اگر میری عبارت قضیۂ کلیہ بھی ہوتی اور میں یوں کہتا کہ "ہر وہ حدیث جس کی اسناد بہت ٹھیک لیکن اس کے مضمون میں کوئی باریک علت ہو...... تو وہ معلول ہے" تو اس کا عکس یہ ہوتا کہ "بعض معلول وہ ہے کہ جس کی اسناد بہت ٹھیک لیکن اس کے مضمون میں کوئی باریک علت ہو" اس لیے کہ موجبہ کلیہ کا عکس موجبہ جزئیہ آتا ہے۔ بہر حال معلول کی صحت اسناد کا ضروری ہونا کسی طرح میری عبارت سے ثابت نہیں ہوسکتا۔ زیادہ توضیح مطلوب ہو تو سنئے کہ میں نے یہ لکھا ہے کہ "ایسی حدیث کو اصطلاح میں معلول کہتے ہیں" یہ نہیں لکھا ہے کہ "ایسی ہی حدیث کو اصطلاح میں معلول کہتے ہیں" یعنی معلول کو "ایسی حدیث" میں منحصر نہیں کردیا ہے میرے اخیر فقرہ کا مفہوم عربی میں یوں ہوگا **كل حديث صفته كذا، يقال له المعلول** جس کا عکس **بعض ما يقال له المعلول حديث صفته كذا** ہوگا۔

یہاں پہنچ کر کر میں ناظرین کو بتانا چاہتا ہوں کہ مجیب نے پہلا اور دوسرا اعتراض اعلام ص ۱۸ کی ابتدائی چار سطروں سے اخذ کر کے لکھا ہے، اس کے بعد طفرہ کر کے ص ۱۹ کی چوتھی سطر پر پہونچ گئے ہیں، یعنی درمیان میں پورے ایک صفحہ کی مقدار (جس میں علامہ ابن القیم کے ایک کلام پر سخت مواخذہ تھا) چھوڑ کر جواب دینا شروع کیا ہے، لیکن ص ۱۹ کی چوتھی سطر کا جواب دینے کے بعد ان کو یاد آیا کہ جس حصہ کا میں نے جواب نہیں دیا ہے، اس کی نسبت کوئی بات بنانی چاہئے، ورنہ اپنے ہوا خواہ بھی جواب سے عاجز سمجھیں گے۔ اس لیے آپ نے یہ لکھا کہ ''جب یہ ثابت ہو چکا کہ اس حدیث کو معلول کہنا خود حافظ ابن حجر اور حنفیہ کے نزدیک محض سند کی وجہ سے ہے، متن میں کوئی علت نہیں اور اسی متن میں علت ہونے کی بنا پر مولف نے صفحہ کا صفحہ سیاہ کیا ہے پس یہ ساری تقریر خود بخود غلط ہوگئی'' (آثار ص ۴۳)

لیکن ناظرین جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ عذر گناہ بدتر از گناہ کے قبیل سے ہے، اس لیے کہ کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوا کہ ابن حجر کے نزدیک ان کا معلول کہنا محض سند کی وجہ سے ہے، بلکہ یہ غلط بیانی وافترا ہے۔

اسی طرح حنفیہ کے نزدیک بھی اس کو معلول کہنا محض سند کی وجہ سے کہیں ثابت نہیں ہوا۔ اس عہد کے کسی حنفی کا قول حنفیہ کا قول نہیں ہوسکتا، نیز اس حنفی نے بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ ابن حجر کا معلول کہنا سند کی وجہ سے ہے، نیز یہ بھی ثابت نہیں ہوا کہ متن میں کوئی علت نہیں ہے، بلکہ ابن حجر وغیرہ کے کلام سے متن میں علت کا ہونا ثابت کیا جا چکا ہے، لہٰذا اعلام ص ۱۸ سطر ۵ سے لے کر ص ۱۹ سطر ۳ تک کی تقریر بالکل درست ہے اور مجیب صاحب نہ اس کا جواب دے سکے ہیں نہ آئندہ دے سکتے انشاء اللہ تعالیٰ۔

صاحب آثار نے میرا تیسرا اعتراض یہ بتایا ہے ''رجال اسناد میں محمد بن اسحاق ہیں، محدثین نے ان پر نہایت سخت جرحیں کی ہیں، حافظ ذہبی نے اپنا فیصلہ یہ لکھا ہے کہ ان کے حافظہ میں کچھ خرابی ضرور ہے۔ اور یہ کہ جس چیز کے روایت کرنے میں وہ تنہا ہوں وہ منکر ہے''

اس کے بعد صاحب آثار نے دو وجہوں سے اس اعتراض کو غلط کہا ہے، پہلی وجہ کا حاصل یہ ہے کہ مولف اعلام نے عطا خراسانی پر شعبہ کی جرح کان نسیاً (بھولنے والے تھے) کی نسبت لکھا ہے کہ یہ جرح بھی مضر نہیں ہے۔ بھول سے کون خالی ہے (اعلام ص ۵) اور ظاہر ہے کہ بھولنا حافظہ کی

خرابی کی وجہ سے ہوتا ہے، لہٰذا ابن اسحاق اور عطا دونوں پر ایک ہی جرح ہوئی، اب اس کو مولف کے انصاف کے سوا اور کیا کہا جائے کہ ایک ہی جرح ہے لیکن وہ آپ کے لیے مضر نہیں اور مخالف کے لیے مضر ہے (الی قولہ) اسی کو اندھے کی ریوڑی کہتے ہیں (آثار ص۴۳و۴۴)

جواب: – ناظرین کو یاد ہوگا کہ مجیب صاحب آثار باب دوم ص ۷۷ میں عطا خراسانی کی جرح وتعدیل کے موقع پر یہ ساری باتیں لکھ چکے ہیں اور میں نے وہاں پر ان کی تقریر کا ایک ایک تار بکھیر دیا ہے۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ سوءِ حفظ اور نسیان میں فرق نہ کرنا جہالت ہے، نیز اس بات کو نظر انداز کر دینا بھی سخت نادانی ہے کہ ابن اسحاق کے سوءِ حفظ کی وجہ سے ذہبی نے ان کے متفردات میں نکارت ہونے کی تصریح کی ہے اور عطاء کے نسیان کی وجہ سے کسی محدث نے بھی ان کے متفردات میں نکارت نہیں مانی ہے۔

صاحب آثار نے میرے اعتراض کے غلط ہونے کی دوسری وجہ یہ لکھی ہے کہ ”ذہبی کی عبارت میں مولف نے سخت خیانت کی ہے، ناظرین پوری عبارت کو ملاحظہ فرمائیں آپ خود بول اٹھیں گے کہ یہ جرح کوئی جرح نہیں، نہ تو ذہبی نے نہ کسی اور محقق نے اس کو جرح شمار کیا ہے ذہبی فرماتے ہیں میرے نزدیک جو بات ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ ابن اسحاق کی حدیث حسن ہے، یہ صالح الحال اور بہت درست گو ہیں، اور جس حدیث میں یہ منفرد ہوں اس میں کچھ نکارت ہوتی ہے کیونکہ ان کے حافظہ میں قدرے خرابی ہے اور بے شک ائمہ حدیث نے ان کی حدیث سے احتجاج کیا ہے اور امام مسلم صحیح مسلم میں ان کی پانچ حدیثیں روایت کرتے ہیں اور ان سے استشہاد کرتے ہیں“ الخ (آثار ص۴۴)

جواب: – ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ مجیب نے سخت خیانت کا دعویٰ تو کر دیا، لیکن ثابت نہ کر سکے کہ میں نے کیا خیانت کی ہے؟ اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی اس کو ثابت نہیں کر سکتے، حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے خود ذہبی کی عبارت نہیں سمجھی ہے۔ مجیب صاحب غور سے سنیں کہ ذہبی نے ابن اسحاق کی نسبت خود آپ کے قول سے دو باتیں لکھی ہیں، ایک یہ کہ وہ حسن الحدیث، صالح الحال اور صدوق ہیں۔ اور دوسری یہ کہ جس حدیث میں ابن اسحاق منفرد ہوں اس میں کچھ نکارت ہوتی ہے، کیونکہ ان کے حافظہ میں قدرے خرابی ہے۔ بالکل ظاہر ہے کہ پہلی بات اس صورت کا حکم ہے جب کہ ابن اسحاق کا کوئی متابع موجود ہو، یعنی جس حدیث کو وہ روایت کرتے ہوں اس کو

کوئی دوسرا بھی روایت کرتا ہو، تو اس وقت میں ان کی حدیث حسن ہوگی؛ اور دوسری بات اس صورت کا حکم ہے جب ابن اسحاق کسی حدیث کے روایت کرنے میں تنہا و متفرد ہوں جیسا کہ خود ذہبی نے اس کی تصریح کر دی ہے، اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بات بصورت وجود متابع ہے۔ نیز اگر تفرد کی صورت میں بھی ان کی حدیث حسن ہو تو لازم آئے گا کہ ابن اسحاق کی حدیث حسن بھی ہو اور اس میں نکارت بھی ہو، حالانکہ حدیث حسن کا نکارت سے پاک ہونا ضروری ہے، جیسا کہ اصول حدیث میں مصرح ہے (دیکھو تدریب ص ۵۱)۔

پس جب ثابت ہو گیا کہ ذہبی کی پہلی بات ابن اسحاق کی حدیث کو حسن کہنا اس صورت میں ہے جب کہ ابن اسحاق کا کوئی متابع موجود ہو، نہ اس صورت کا جب کہ ابن اسحاق متفرد ہوں، تو معلوم ہوا کہ وہ بات ہماری بحث سے بالکل بے تعلق ہے، اس لیے کہ جس حدیث میں یہاں گفتگو ہے اس میں ابن اسحاق متفرد ہیں، لہٰذا ذہبی کی پہلی بات کو اس حدیث کی بحث میں نقل نہ کرنا خیانت نہیں ہے، بلکہ نقل کرنا خیانت وابلہ فریبی ہے۔ یہاں تو بس دوسری بات نقل کرنی چاہئے جو تفرد کی نسبت ذہبی نے لکھی ہے، اس لیے میں نے صرف اسی کو لکھا ہے۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ابن اسحاق کے حسن الحدیث وصالح الحال وصدوق ہونے سے مجیب صاحب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا؛ جب کہ ذہبی نے خود ان اوصاف کو لکھنے کے بعد ابن اسحاق کے تفردات میں نکارت تسلیم کی ہے، اور حدیث مسند میں ابن اسحاق متفرد ہیں، لہٰذا اس میں بھی نکارت ہے۔ باقی رہا مجیب صاحب کا یہ کہنا کہ ''یہ جرح کوئی جرح نہیں ہے'' تو گزارش ہے کہ اولاً تو مجیب خود اس کے خلاف لکھ چکے ہیں اور اس کو ہلکی جرح مان چکے ہیں (دیکھو س،۲ ص ۴۴) لہٰذا جرح مان کر چاہے ہلکی ہی سہی اس کی بالکل نفی کرنا حافظہ نباشد والی مثال ہے۔

ثانیاً:- اگر حافظہ میں ایسی خرابی کا ہونا جس کی وجہ سے راوی کے متفردات میں نکارت پائی جانے لگے، جرح نہیں ہے، تو مجیب صاحب ذرا جرح کی تعریف کر دیں، اور یہ بھی بتائیں کہ کہیں تو **یعتبر به** بھی جرح کے قریب قریب ہو جاتا ہے اور یہاں حافظہ کی وہ خرابی جو موجب نکارت ہو وہ بھی جرح نہیں رہتی، کجا آں شوراشوری کجا ایں بے نمکی -

علاوہ بریں مجیب کا صرف بے دلیل دعویٰ کر دینا ان کے ہوا خواہوں کے نزدیک بھی قابل تسلیم نہیں ہوسکتا، اصول حدیث سے ان کو ثابت کرنا چاہئے کہ حافظہ کی جس خرابی سے روایت میں نکارت پیدا ہو جائے وہ جرح نہیں ہے۔

پھر یہ بات قابل غور ہے کہ اگر ذہبی کی جرح صرف اس لیے جرح نہیں کہ انھوں نے حسن الحدیث وغیرہ کہنے کے بعد یہ جرح کی ہے، تو مجیب کا خصم بھی یہ کہہ سکتا ہے حسن الحدیث وغیرہ کہنا بھی کوئی توثیق نہیں ہے، جب کہ ذہبی نے اس کے بعد یہ کہہ دیا ہے کہ ان کے تفردات میں نکارت ہے، خصوصاً جب کہ اصول حدیث میں مصرح ہے کہ جرح تعدیل پر مقدم ہوتی ہے۔

اب مجیب کے چند لطائف ملاحظہ ہوں:

۱:- ذہبی کے لفظ **ما انفرد به ففيه نكارة** کا ترجمہ تو یہ کرتے ہیں کہ ''جس حدیث میں یہ منفرد ہوں اس میں کچھ نکارت ہوتی ہے''، یعنی **نكارة** کی تنوین کو تقلیل کے لیے مان کر اس کا ترجمہ کچھ کرتے ہیں، اور **قد احتج به ائمة** کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ ''بے شک ائمۂ حدیث نے ان کی حدیث سے احتجاج کیا ہے'' یہاں **ائمة** کی تنوین کو تقلیل کے لیے نہیں مانتے، اس تفریق کی بجز اس کے اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ یہاں تقلیل ماننا خواہش نفس کے خلاف اور وہاں موافق تھا۔ مجیب کے اصول سے **قد احتج به ائمة** کا ترجمہ یہ ہونا چاہئے کہ ''کچھ اماموں نے ابن اسحاق سے احتجاج کیا ہے''

۲:- لفظ صدوق کا لطیفہ باب اول میں ملاحظہ ہو۔

۳:- ابن اسحاق سے بخاری نے روایت ہی نہیں کی، مسلم نے روایت تو کی ہے مگر احتجاج نہیں کیا ہے، چنانچہ مجیب نے خود تصریح کی ہے کہ (مسلم) ان سے استشہاد کرتے ہیں۔ اب ابن اسحاق سے جن ائمہ کے احتجاج کرنے کا ذکر ذہبی نے کیا وہ اصحاب سنن اور دیگر مصنفین ہیں، پس مجیب صاحب بتائیں کہ کیا بخاری ومسلم کے علاوہ اور مصنفین کے احتجاج کرنے سے بھی ان کے نزدیک راوی کی توثیق ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ثابت ہوتی تو ابن اسحاق سے بخاری ومسلم کے علاوہ دوسرے ائمہ کا احتجاج کرنا آپ کے لیے کچھ مفید نہیں، اور اگر دوسروں کے احتجاج کرنے سے بھی توثیق ثابت ہوتی ہے تو عطاء وعلی بن زید نے کیا قصور کیا تھا؟

۴:- ذہبی نے **وقد احتج به ائمة** کے بعد **فالله اعلم** بھی لکھا ہے مگر مجیب صاحب نے اس کا ترجمہ نہیں کیا۔ پوری عبارت کا ترجمہ حسب تحقیق مجیب یوں ہونا چاہئے ابن اسحاق سے کچھ اماموں نے احتجاج کیا ہے پس اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

(جاری ہے)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت وراستی کے دلائل کتاب وسنت سے

تحریر: دکتور محمد بن عبداللہ الوھیبی　　　ترجمہ: مولانا ازہر رشید الاعظمی

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عدل ہونا اہل سنت کے مسلّمہ عقائد اوران کے اجماعی مسائل میں سے ایک ہے، یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ ان امور میں سے ہے جو دین ومذہب سے یقینی طور پر معلوم ہیں، اور جس پر علماء کرام قرآن وحدیث کی بہت سی دلیلوں سے استدلال کرتے ہیں، ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

قرآن کے دلائل:

پہلی آیت:- اللہ تعالی کا ارشاد ہے:﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا﴾(۱)

ترجمہ:''بے شک اللہ خوش ہوا ان مسلمانوں سے جب کہ وہ آپ سے بیعت کررہے تھے درخت کے نیچے، اور اللہ کو معلوم تھا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا، سو اللہ نے ان میں اطمینان پیدا کر دیا اور ان کو ایک لگتے ہاتھ فتح بھی دے دی''۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہماری تعداد اس بیعت میں ایک ہزار چار سو تھی(۲)۔

یہ آیت کریمہ اللہ تعالی کی طرف سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے تعدیل وتزکیہ کے باب میں ظاہر

---

(۱)سورة الفتح: ۱۸

(۲)صحيح بخاري: كتاب المغازي- باب غزوة الحديبية- حديث(٤١٥٤)، فتح الباري: ٥٠٧/٧، طبعة الريان.

الدلالۃ ہے، اور اس میں اللہ تعالی نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جس باطنی اور روحانی پاکیزگی کو بیان کیا ہے، اس کی نہ کوئی اور خبر دے سکتا ہے، نہ کوئی دوسرا اس کی قدرت رکھتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی ان سے راضی ہوا،'' اور جس سے اللہ تعالی راضی ہو اس کی موت کفر پر نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ اعتبار اسلام کی حالت میں وفات پانے کا ہے۔ پس اللہ تعالی کی رضا اسی کو حاصل ہوگی، جس کی بابت اسے علم ہو کہ وہ اسلام کی حالت میں وفات پائے گا''(۱)۔

اس کی تائید صحیح مسلم کی اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا يَدخُلُ النَّارَ إنْ شاءَ الله مِنْ أصْحابِ الشَّجَرَةِ أحَدٌ، الَّذينَ بَايَعُوا تَحْتَها(۲).

جنھوں نے درخت کے نیچے بیعت رضوان میں حصہ لیا ہے، ان میں سے کوئی بھی ان شاء اللہ جہنم میں نہیں جائے گا۔

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''رضا (خوشنودی) اللہ تعالی کی ایک قدیم صفت ہے، اس لیے اللہ تعالی اسی شخص سے راضی اور خوش ہوگا، جس کے بارے میں وہ یہ جانتا ہے کہ اس کا وصال رضا کے تقاضوں کے ساتھ ہوگا - اور جس سے اللہ تعالی راضی ہو گیا اس سے کبھی ناراض نہیں ہوگا - پس جس شخص کے متعلق اللہ تعالی نے یہ خبر دے دی کہ وہ اس سے راضی ہوا تو وہ یقیناً جنتی ہے، اگر چہ اس کی رضا اس شخص کے ایمان لانے اور عمل صالح کرنے کے بعد ہو، تو اللہ تعالی اپنی اس رضا کا ذکر مدح وثنا اور تعریف کے مقام میں کرتے ہیں، اگر اللہ کے علم میں یہ بات ہوتی کہ یہ شخص اس کے بعد ایسا کام کرے گا جو اس کی ناراضگی کا سبب بنے گا تو وہ کبھی تعریف کا مستحق نہ ہوتا(۳)۔

اور ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں کہ: ''جن کے بارے میں اللہ رب العزت نے یہ خبر دے دی کہ وہ ان کے دلوں کی باتوں کو جانتا ہے، اور وہ ان سے راضی ہے، اور اس نے ان پر سکینہ نازل فرمایا ہے، تو اب کسی کے لیے یہ قطعاً جائز نہیں ہے کہ ان کے بارے میں توقف سے کام لے، یا کسی طرح کے شک میں مبتلا ہو(۴)۔

---

(۱) الصواعق المحرقة: ٣١٦

(۲) صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة -باب من فضائل أصحاب الشجرة- ١٩٤٢/٤، حديث ٢٤٩٦.

(۳) الصارم المسلول: ٥٧٢، ٥٧٣، ط: دار الكتب العلمية، تعليق: محمد محي الدين عبد الحميد.

(۴) الفصل في الملل والنحل: ١٤٨/٤

دوسری آیت:-اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ تَرٰىہُمۡ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضۡوَانًا ۫ سِیۡمَاہُمۡ فِیۡ وُجُوۡہِہِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ ؕ ذٰلِکَ مَثَلُہُمۡ فِی التَّوۡرٰىۃِ ۚۖۛ وَ مَثَلُہُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ ۚ۟ۛ کَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسۡتَغۡلَظَ فَاسۡتَوٰی عَلٰی سُوۡقِہٖ یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیۡظَ بِہِمُ الۡکُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡہُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا﴾[1].

ترجمہ:''محمد اللہ کے پیمبر ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ تیز ہیں کافروں کے مقابلے میں (اور) مہربان ہیں آپس میں۔ تو انہیں دیکھے گا (اے مخاطب) کہ (کبھی) رکوع کر رہے ہیں (کبھی) سجدہ کر رہے ہیں، اللہ کے فضل اور رضا مندی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں، ان کے آثار سجدہ کی تاثیر سے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں، یہ ان کے اوصاف توریت میں ہیں۔ اور انجیل میں ان کا وصف یہ ہے کہ وہ جیسے کھیتی کہ اس نے اپنی سوئی نکالی، پھر اس نے اپنی سوئی کو قوی کیا، پھر وہ اور موٹی ہوئی، پھر اپنے تنہ پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی۔ (یہ نشو ونما صحابہ کو اس لیے دیا) تا کہ کافروں کو ان سے جلائے، اور اللہ نے ان سے جو ایمان لائے ہیں اور (جنھوں نے) نیک کام کیے، مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے''۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ عیسائی جب ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھتے جنھوں نے ملک شام فتح کیا تھا تو کہتے کہ خدا کی قسم یہ لوگ ہمارے علم کے مطابق حواریوں سے بہتر ہیں۔ اور ان کی یہ بات صحیح ہے، اس لیے کہ امت محمدیہ کی عظمت شان کا ذکر اگلی کتابوں میں بھی کیا گیا ہے، اور اس امت میں سب سے بزرگ و برتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام ہیں، جن کی تعریف اللہ تعالی نے آسمانی کتابوں اور مشہور روایتوں میں کی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالی نے یہاں فرمایا: ﴿ذٰلِکَ مَثَلُہُمۡ فِی التَّوۡرٰىۃِ﴾ یہ ان کی مثال ہے توریت میں، پھر فرمایا: ﴿وَمَثَلُہُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ﴾ اور ان کی مثال انجیل میں اس کھیتی کی طرح ہے جس نے اپنی کونپل نکالی، ﴿فَاٰزَرَہٗ﴾ پھر اس کو مضبوط کیا، ﴿فَاسۡتَغۡلَظَ﴾ یعنی وہ کھیتی موٹی اور لمبی ہوئی، ﴿فَاسۡتَوٰی عَلٰی سُوۡقِہٖ یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ﴾ پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی، اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

(۱) سورۃ الفتح: ۲۹.

صحابۂ کرام ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی مدد ونصرت اور تائید کی، چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ آپ کا حال وہی تھا، جو سوئی اور اکھوے کا کاشتکاروں کے لیے ہوتا ہے، تا کہ ان سے کافروں کو جلائے[1]۔

ابن الجوزی کہتے ہیں کہ: 'یہ وصف جمہور علماء کے نزدیک تمام صحابۂ کرام کا تھا'[2]۔

تیسری آیت:- اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾[3]۔

ترجمہ: ''ان حاجت مند مہاجروں کا (یہ خاص طور پر) حق ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے جدا کر دیے گئے ہیں، اللہ کے فضل اور رضامندی کے طلبگار ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ تو صادق ہیں۔ اور ان لوگوں کا (بھی حق ہے) جو دار الاسلام اور ایمان میں ان کے قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں، محبت کرتے ہیں اس سے جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اور اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں اس سے جو کچھ کہ انہیں ملتا ہے، اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگر چہ خود فاقہ میں ہی ہوں۔ اور جو اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے، سو ایسے ہی لوگ تو فلاح پانے والے ہیں۔ اور ان لوگوں کا (بھی حق ہے) جو ان کے بعد آئے، (اور وہ) یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں، اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ ہونے دے، اے ہمارے پروردگار تو تو بڑا شفیق ہے بڑا مہربان ہے''۔

---

(۱) الاستيعاب لابن عبد البر ١/٦، ط: دار الكتاب العربي بحاشية الإصابة، وتفسير ابن كثير: ٤/٣٠٤، ط: دار المعرفه، بيروت.

(۲) زاد المسير: ٤/٢٠٤

(۳) سورة الحشر: ٨ - ١٠

ان آیات میں اللہ تعالی نے مالِ فے - دشمن سے جنگ کے بغیر حاصل ہونے والے مال- کے حق داروں کے صفات وحالات کو بیان کیا ہے، اور وہ تین قسم کے لوگ ہیں: پہلی قسم ہے ﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهٰجِرِيْنَ﴾ یعنی حاجت مند مہاجرین کی؛ دوسری قسم ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ یعنی ان لوگوں کی جو دارالاسلام یعنی مدینہ میں اور ایمان میں ان مہاجرین سے پہلے جگہ بنائے ہوئے ہیں؛ اور تیسری قسم ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ﴾ یعنی ان لوگوں کی جو ان کے بعد آئے یا آئیں گے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کریمہ سے کیا ہی خوب نتیجہ اخذ کیا ہے، فرماتے ہیں کہ جو شخص صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو گالی دے اور ان کی عیب جوئی کرے تو مالِ فے میں اس کا کوئی حصہ نہ ہوگا، اس لیے کہ وہ اس تعریف سے محروم ہے جو اللہ تعالی نے تیسری قسم والوں کی ان کے اس کہنے کی وجہ سے کی ہے کہ: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ﴾ (اے ہمارے پروردگار! ہم کو بخش دے، اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں)۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ: "لوگ تین مراتب کے ہیں، دو مرتبے تو گزر گئے، ایک مرتبہ باقی رہ گیا ہے۔ لہذا تمہارے لیے سب سے بہتر یہی ہے کہ تم اس مقام ومرتبہ پر رہو جو باقی رہ گیا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی: ﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ اور فرمایا کہ یہ مہاجرین ہیں، اور یہ مرتبہ گزر چکا ہے۔ پھر آپ نے ﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ پڑھا، اور فرمایا کہ یہ انصار ہیں، اور یہ درجہ بھی گزر چکا۔ پھر آپ نے پڑھا: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ اور فرمایا کہ پہلے دونوں درجے گزر چکے اور اب یہ آخری درجہ باقی رہ گیا ہے، سو تمہارے لیے سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ تم اس مقام ومرتبہ پر رہو جو باقی رہ گیا ہے، کہ تم لوگ ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے رہو[1]۔

(۱) الصارم المسلول: ٥٧٤، اس اثر کو حاکم نے بھی (۲/۴۸۴) میں روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے، اور ذہبی نے ان کی تصحیح کو برقرار رکھا ہے۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''لوگوں کو اس بات کا حکم دیا گیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے دعائے مغفرت کریں، لیکن انھوں نے ان کی شان میں گستاخی کی''(۱)۔

ابونعیم نے لکھا ہے: اس شخص سے زیادہ برا حال کس کا ہوگا، جو اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے، اور ان کی نافرمانی اور حکم عدولی کا راستہ اختیار کرے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالی نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے درگزر کریں، اور ان کے لیے مغفرت طلب کریں، اور ان کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾(۲) (اور اگر آپ تندخو، سخت طبع ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہوگئے ہوتے، سو آپ ان سے درگزر کیجیے، اوران کے لیے استغفار کردیجیے اور ان سے معاملات میں مشورہ لیتے رہیے)، نیز فرمایا: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (اور جو مسلمانوں میں داخل ہو کر آپ کی راہ پر چلے تو آپ اس کے ساتھ (مشفقانہ) فروتنی سے پیش آئیے)۔ تو اب جو شخص انھیں گالی دے، ان کی تنقیص کرے، ان سے بغض رکھے، اور ان کے مشاجرات اور باہمی جنگوں کی عمدہ تاویل، اور ان کو اچھے معنی پر محمول نہ کرے، تو وہ اس ادب واخلاق کی حد سے منحرف ہوجائے گا جس کا حکم اللہ تعالی نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سلسلے میں بڑی تاکید کے ساتھ دیا ہے، صحابۂ کرام کی شان میں زبان درازی وہی شخص کرے گا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، اور اسلام اور مسلمانوں کا بدخواہ اور بدطینت ہوگا(۳)۔

حضرت مجاہد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو برا بھلا نہ کہو، اس لیے کہ اللہ تعالی نے ان کے لیے استغفار (مغفرت طلب کرنے) کا حکم دیا ہے، حالانکہ اللہ تعالی کو یہ بات معلوم تھی کہ ان کے درمیان قتال ہوگا(۴)۔

---

(۱) صحیح مسلم: ۲۳۱۷/۴ حدیث (۳۰۲۲)

(۲) سورة آل عمران: ١٥٩

(۳) الإمامة: ٣٧٥-٣٧٦ لأبي نعيم، تحقيق د. علي فقيهي، مكتبة العلوم والحكم بالمدينة، ط١، عام ١٤٠٧هـ

(۴) الصارم المسلول: ٥٧٤، نیز دیکھئے منهاج السنة: ١٤/٢، اس اثر کو امام احمد نے بھی فضائل الصحابہ میں حدیث نمبر ۱۸۷ اور ۱۷۴۱ کے تحت روایت کیا ہے، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے اور منهاج السنہ ۲۲/۲ میں ابن بطہ کے حوالے سے اس کو ذکر کیا ہے۔

چوتھی آیت:- اللہ تعالی کا فرمان: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ لا رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾(۱)

ترجمہ:''اور (جو) مہاجرین وانصار میں سے سابق ومقدم (ہیں) اور جتنے لوگوں نے نیک کرداری میں ان کی پیروی کی اللہ ان (سب) سے راضی ہوا اور وہ (سب) اس سے راضی ہوئے، اوراس نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں کہ ان کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی ان میں یہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے یہی بڑی کامیابی ہے''۔

اس آیت کا مفہوم بالکل واضح ہے، ابن تیمیہ کہتے ہیں: ''سابقین سے احسان (نیک کرداری) کی شرط کے بغیر اللہ تعالی راضی ہوا، لیکن تابعین سے اللہ تعالی کے راضی ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ نیک کرداری کے ساتھ سابقین کی پیروی کریں''(۲)۔

اور نیک کرداری کے ساتھ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اتباع کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ان سے راضی بھی ہو اور ان کے لیے استغفار بھی کرتا رہے۔

پانچویں آیت:- اللہ تعالی کا ارشاد: ﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ط اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ط وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾(۳)

ترجمہ:''تم میں جو لوگ فتح (مکہ) سے قبل ہی خرچ کر چکے اور لڑ چکے (وہ ان کے برابر نہیں جو بعد فتح لڑے اور خرچ کیا) وہ لوگ درجہ میں بڑھے ہوئے ہیں ان لوگوں سے جنہوں نے بعد کو خرچ کیا اور لڑے، اور اللہ نے بھلائی کا وعدہ تو سب ہی سے کر رکھا ہے''۔

مجاہد اور قتادہ کہتے ہیں کہ الحُسنیٰ سے مراد جنت ہے(۴)۔

اور ابن حزم نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یقیناً تمام صحابۂ کرام جنتی

---

(۱) سورة التوبة: ۱۰۰

(۲) الصارم المسلول: ۵۷۲

(۳) سورة الحديد: ۱۰

(۴) تفسير ابن جرير: ۱۲۸/۲۷، دار المعرفة، بيروت، ط:۴، ۱۴۰۰ھ

ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمادیا: ﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر ایک سے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے(۱)۔

چھٹی آیت:- اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾(۲)

ترجمہ: ”بے شک اللہ نے نبی پر اور مہاجرین اور انصار پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی جنھوں نے نبی کا ساتھ تنگی کے وقت میں دیا بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں کچھ تزلزل ہو چلا تھا پھر (اللہ نے) ان لوگوں پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمادی، بیشک وہ ان کے حق میں بڑا شفیق ہے بڑا رحمت والا ہے“۔

غزوہ تبوک میں-جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے-عورتوں اور ان لوگوں کے علاوہ جو اللہ کے نزدیک معذور تھے، اس وقت کے تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم شریک تھے۔ رہے وہ تین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جو اس میں شریک نہیں ہو سکے تھے، تو اس کے بعد آیت توبہ نازل ہوئی جس میں ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان کر دیا گیا۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۶۵ کا بقیہ اس نے اس کی اس طرح تصویر بنائی ہے کہ اس کے سامنے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور کتب خانے کا ایک حصہ بہت خوبصورت شکل میں نظر آ رہا ہے۔

بصرہ کا یہ کتب خانہ اس میں کام کرنے والے طلبہ کو امداد اور وظیفے بھی دیا کرتا تھا۔

دوسرا دار العلم جو بصرہ میں قائم ہوا، تو یہ وہ تھا جس کو وزیر ابو منصور شاہ مروان نے وقف کیا تھا، اس میں نہایت قیمتی اور عمدہ کتابیں تھیں، جیسا کہ اس کی طرف ابن الاثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ کیا ہے، یہ بھی ۴۸۳ھ میں اسی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا، جس میں اس کا پہلا کتب خانہ جلا تھا، اور کاتب ابوعلی بن سوار نے ایک کتب خانہ رام ہرمز میں وقف کیا تھا، جس کو دار العلم کہا جاتا تھا۔

---

(۱) سورۃ الحدید: ۱۰

(۲) سورۃ التوبۃ: ۱۱۷

أحكام السواك

مسواک کے احکام اور اس کے فضائل

للدكتور: عبدالله بن معتق السهلي ترجمہ:مولانا فریدالحق صاحب
استاذ مرقاۃ العلوم، مئو

یقیناً تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، ہم اسی کی تعریف کرتے ہیں اور اسی سے مدد کے خواستگار ہیں اور اسی سے مغفرت طلب کرتے ہیں، اور ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں اپنے نفس کے شر سے اور برے اعمال سے۔ اللہ جس کو ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، اور جس کو گمراہ اور راہ راست سے دور کردے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ بجز اللہ کے کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اس کی خدائی میں کوئی شریک نہیں۔ اور اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْن﴾
(سورہ آل عمران آیت ۱۰۲)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور نہ مرو مگر اس حالت میں کہ تم فرمانبرداری کرنے والے ہو۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا﴾ (سورہ نساء آیت ۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کا جوڑا بھی پیدا کیا، اور ان دونوں سے پھیلا دیا ہے بہت سے مردوں اور عورتوں کو۔ اور اسی

سے ڈرتے رہو جس کا واسطہ دے کر تم سوال کرتے ہو، اور (خبردار رہو) قرابتوں سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر نگہبان ہے۔

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْدًا یُصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا﴾ (سورہ احزاب آیت ۷۰)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور سچ بات کہو جو تمہارے اعمال کی اصلاح کرے گی اور تمہارے گناہوں کو ختم کردے گی۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ یقیناً بہت بڑی کامیابی پائے گا۔

امابعد! اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی معزز کتاب میں اور رسول اللہ ﷺ نے احادیث مبارکہ میں ایسے صحیح اور مستحکم اصول وقواعد بیان فرمائے ہیں جن پر چلنا اور اختیار کرنا ہر مسلمان پر واجب اور ضروری ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہ شَدِیْدُ الْعِقَابِ﴾ (سورۂ حشر آیت ۷)

اللہ کا رسول تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس کو چھوڑ دو، اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: (فمن رغب عن سنتي فليس مني) (بخاری ج ۶ ص ۱۱۶ امسلم ج ۲ ص ۱۰۲)

جو میری سنت سے روگردانی کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مسواک نبی ﷺ کی وہ سنت ہے جس کا آپ ﷺ نے امت کو حکم دیا ہے اور اس کے اوپر عمل کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ چنانچہ آنحضور ﷺ کا بیان ہے کہ مسواک خصال فطرت اور طبعی عادتوں میں سے ہے، منھ کی صفائی اور رب کی خوشنودی کا ذریعہ ہے، اور ہر مسلمان کو جیسے باطنی طہارت مثلاً دل کی صفائی اور خالص اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح اسے ظاہری طہارت مثلاً صفائی ستھرائی، میل کچیل اور نجاستوں کو دور کرنے کا بھی مکلّف بنایا گیا ہے، اور مسواک اسی ظاہری طہارت کے قبیل سے ہے۔

بحث اول

مسواک کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

مسواک کی لغوی تعریف السواک بکسر السین (سین کے زیر کے ساتھ)، اس کا اطلاق نفس فعل پر ہوتا ہے اور وہ ہے دانتوں کا رگڑنا، اور اس آلہ پر بھی ہوتا ہے جس سے دانت کو رگڑا جائے، اور آلہ کے لیے مسواک کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ سواک منھ صاف کرنے کا بھی نام ہے، چنانچہ اگر کوئی مسواک کرے تو کہا جاتا ہے ساک فاہ یسوکہ سوکاً. سواک مذکر ہے، امام زہری نے اہل عرب سے اس کے مذکر ہونے کو نقل کیا ہے۔ اور لیث بن المظفر نے سواک کو مؤنث کہا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ صاحب محکم فرماتے ہیں کہ مذکر ومؤنث دونوں لغت ہے۔ اہل لغت کا کہنا ہے کہ سواک کی جمع سُوُکُ ہے بضم السین والواو بروزن کتب، اور سُوُک بھی ہے بسکون الواو. بسا اوقات ہمزہ کے ساتھ بھی آئی ہے سُؤُک.

سواک، ساک الشیٔ إذا دلکہ سے مشتق ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ تساوک بمعنی تمایل سے مشتق ہے، چنانچہ اہل عرب بولتے ہیں جاء ت الإبل تساوک جب کہ اونٹ چلنے میں ایک طرف مائل اور جھکا ہوا ہو۔ صحیح یہ ہے کہ وہ ساک الشیٔ إذا دلکہ سے مشتق ہے۔

مسواک فقہاء کرام کی اصطلاح میں

فقہاء کرام نے مسواک کی جو تعریفیں کی ہیں وہ قریب قریب ایک ہی ہیں۔ حنفیہ مسواک کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ اس لکڑی کو کہتے ہیں جو دانتوں کو رگڑنے اور صاف کرنے کے لیے مخصوص کی گئی ہو، مالکیہ فرماتے ہیں کہ مسواک لکڑی اور اس کے علاوہ کسی چیز کا استعمال کرنا دانتوں کی زردی اور پیلے پن کو دور کرنے کے لیے۔ شافعیہ اور حنابلہ کا قول ہے کہ مسواک لکڑی اور اس کے علاوہ کا استعمال کرنا ہے دانتوں کے تغیر اور اس کی زردی کو دور کرنے کے لیے۔

بحث ثانی

مسواک کی مشروعیت اور فضیلت کے بارے میں

مسواک کی سنیت اور فضیلت کے بارے میں دراصل وہ احادیث مبارکہ ہیں جن میں اس کی اہمیت کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میری امت یا لوگوں پر گراں نہ معلوم ہوتا، تو میں ان کو مسواک کرنے کا حکم دیتا ہر نماز کے وقت، اور ایک روایت میں ہے ہر وضو کے وقت (بخاری ج ۱ ص ۲۱۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ کا معمول تھا جب گھر میں تشریف لاتے تو سب سے پہلے مسواک کرتے (بخاری ج ۲ ص ۲۳۴)

حضرت حذیفہؓ کی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ جب بھی رات میں اٹھتے تو اپنے منھ کو مسواک سے صاف کرتے (بخاری ج ۱ ص ۶۶)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث میں ہے کہ انھوں نے اللہ کے نبی ﷺ کے پاس رات گزاری دیکھا کہ آپ رات کے اخیر میں بستر سے اٹھے اور گھر سے باہر نکل کر آسمان کی طرف نظر اٹھائی پھر سورۂ آل عمران کی آیت ان فی خلق السمٰوات والارض سے لے کر فقنا عذاب النار تک تلاوت فرمائی، اس کے بعد گھر میں لوٹ آئے، مسواک کیا اور وضو کیا پھر لیٹ گئے، تھوڑی دیر کے بعد پھر اٹھے، گھر سے باہر نکلے، آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور سورۂ آل عمران کی مذکورہ آیتیں تلاوت فرمائیں، پھر گھر میں آئے مسواک اور وضو کیا اور کھڑے ہو کر تہجد کی نماز پڑھی۔ (مسلم ج ۱ ص ۲۲۱)

حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تم لوگوں سے مسواک کے بارے میں بہت کچھ بیان کر چکا ہوں (بخاری ج ۳ ص ۱۳۴)

حضرت عائشہؓ کہا کرتی تھیں کہ اللہ کے احسانات میں سے ایک احسان مجھ پر یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے میری باری کے دن میرے گھر میں انتقال فرمایا، انتقال کے وقت آپ کا سر مبارک

میرے سینےاور ہنسلی کے درمیان تھا،اللہ تعالیٰ نے آپ کی وفات کے وقت میرااورآپ کاتھوک ملادیا، وہ یوں کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ ایک مسواک لیے ہوئے آئے، میں حضور ﷺ کوسہارا دیے ہوئے تھی، میں نے دیکھا کہ آپ مسواک کی طرف توجہ فرمارہے ہیں، مجھے معلوم تھا کہ آپ مسواک کو بہت پسند کرتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ کیا یہ مسواک آپ کے لیے لوں؟ آپ ﷺ نے سر سے اشارہ فرمایا، چنانچہ میں نے وہ مسواک (عبدالرحمٰن بن ابی بکر سے لے کر) آپ کو دی لیکن آپ پر بیماری کا غلبہ تھا،اس لیے میں نے کہا کیانرم کردوں۔آپ ﷺ نے اشارہ سے فرمایاہاں (میں نے چبا کر) نرم کردی،آپ نے وہ مسواک دانتوں پر پھیری (بخاری ج۵ص۱۴۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتی ہیں کہ مسواک منھ کی صفائی کا ذریعہ اوررب کی رضامندی کا وسیلہ ہے۔

مذکورہ احادیث کے علاوہ دیگراحادیث بھی مسواک کی مشروعیت اوراس کی اہمیت پر دلالت کرتی ہیں۔مسواک کی فضیلت کے متعلق صرف یہی ایک حدیث أنــه مــرضــاة للرب (رب کی خوشنودی کا ذریعہ ہے) وارد ہوئی ہوتی تو کافی تھی،اس لیے کہ مسلمان کوانھی اعمال کے کرنے کاحکم دیا گیاہےجن سے اللہ راضی ہواور یہی چیز حدیث مذکورہ میں موجود ہے۔

بحث ثالث

مسواک خصال فطرت میں سےایک عمدہ خصلت ہے

مسواک کے خصال فطرت سے ہونے پر کئی ایک حدیثیں دلالت کرتی ہیں،جن میں سے بعض درج ذیل ہیں:

۱:-حضرت عائشہؓ کی حدیث ہےفرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ فطرت سے دس چیزیں ہیں (۱) مونچھ کتروانا (۲) داڑھی بڑھانا (۳) مسواک کرنا (۴) ناک میں پانی ڈالنا (۵) ناخن کاٹنا(۶)انگلیوں کے درمیان کی میل کوصاف کرنا(۷)بغل کابال اکھاڑنا (۸) ناف کے نیچے کا بال مونڈنا (۹) پانی سے استنجا کرنا،(حدیث کے راوی) زکریا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ راوی حدیث مصعبؒ کہتے ہیں کہ دسویں چیز مجھے یادنہیں ہے کہ حضور نے کیا کہا تھاشاید وہ مضمضہ یعنی کلی کرنا ہے۔

(مسلم ج۱ص۲۲۳)

۲:-عمار بن یاسرؓ کی حدیث ہے کہ اللہ کے رسولﷺ نے فرمایا کہ فطرۃ سے ہے: کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا، مونچھ کترانا، ناخن کاٹنا، بغل کا بال اکھاڑنا، ناف کے نیچے کا بال استرہ سے صاف کرنا، پوروں کے میل کو دھونا، اور پانی سے استنجا کرنا، ختنہ کرانا (ابوداؤد ج۱ص۴۵)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اللہ تعالی کے قول **و اذ ابتلیٰ ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن** کی تفسیر میں مروی ہے کہ کلمات سے مراد وہ دس طہارتیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا، پانچ کا تعلق سر سے ہے اور پانچ کا تعلق باقی جسم سے ہے۔ سر کی طہارت ہے: مونچھ کاٹنا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا، مانگ نکالنا۔ اور جسم کی طہارت ہے ناخن کاٹنا، ناف کے نیچے کا بال بنانا، ختنہ کرنا، بغل کا بال اکھاڑنا، پائخانہ اور پیشاب کی نجاست کو پانی سے دھونا۔

علامہ ابن حجرؒ اس فطرت پر کلام کرتے ہوئے جس کا ذکر مذکورہ احادیث میں کیا گیا ہے، فرماتے ہیں کہ خصال فطرت کو اختیار کرنے والا شخص اس فطرت کے ساتھ متصف ہو جاتا ہے، جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا، اور اس کے حاصل کرنے پر آمادہ کیا اور جسے انسان کے لیے پسند فرمایا، اور انھیں فطری خصلتوں کی وجہ سے کامل صفات اور افضل صورت والا بن جاتا ہے۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ فطرت دو قسم کی ہے، ایک فطرۃ قلبیہ یعنی اللہ کی معرفت حاصل کرنا، اس سے محبت کرنا اور اللہ کو اس کے ماسوا پر ترجیح دینا۔ دوسرے فطرۃ عملیہ یعنی وہ خصلتیں جن کو احادیث سابقہ میں بیان کیا گیا ہے، ان میں ہر ایک دوسرے کو طاقت اور قوت پہنچاتی ہے۔ (فتح الباری ج۱۰ص۳۳۹)

شیخ عبدالرحمٰن بن ناصر سعدیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے فطرت کے احکام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، جس میں سے ایک کا تعلق قلب اور روح کی صفائی سے ہے، اور وہ ایمان باللہ اور اس کے مقتضیات ہیں، مثلاً اللہ سے ڈرنا اور اس کی رحمت کا امید وار ہونا، اس سے محبت کرنا اور ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کرنا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ط لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ

الْمُشْرِكِيْنَo﴾ (سورہ روم آیت ۳۰-۳۱) پس اپنے چہرہ کو ہر چیز سے کاٹ کر دین کی طرف متوجہ کر دیں، یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے اللہ کی پیدا کردہ چیزوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہے، یہی سیدھا اور مضبوط دین ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔ دین کے لیے چہرہ کو قائم کریں اس حال میں کہ تم خدا کی طرف رجوع کرنے والے ہو، اسی سے ڈرتے رہو اور نماز قائم کرو اور شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو، یہی وہ چیزیں ہیں جو نفس کا تزکیہ کرتی ہیں اور دل کو باطنی نجاستوں سے پاک کرتی ہیں۔ برے اخلاق کو ختم کرتی ہیں اور عمدہ اخلاق سے آراستہ کرتی ہیں۔ اور یہی چیزیں اصول ایمان اور افعال قلوب ہیں۔

اور دوسرے حصہ کا تعلق ہے ان چیزوں سے جو ظاہر بدن کی صفائی وطہارت کا ذریعہ ہیں، مثلاً میل کچیل کو دور کرنا اور بدن سے گندگی کو صاف کرنا، یہ وہ دس خصائل ہیں جو مذہب اسلام کے محاسن اور اس کی خوبیوں میں سے ہیں اور انسانی اعضا کو صاف ستھرا رکھنے اور انھیں کمال تک پہنچانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں، تاکہ ان کی صحت مکمل ہو اور ہر مقصد کے لیے آمادہ وتیار رہیں۔

چوتھی بحث
حکم مسواک کے بیان میں

مسواک کے حکم کے بارے میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں، اکثر حضرات مسواک کرنے کو سنت قرار دیتے ہیں، اور بعض حضرات مثلاً اسحاق، داؤد، ابن حزم کا خیال ہے کہ مسواک واجب ہے۔

قائلین سنت کے دلائل درج ذیل ہیں

۱:- حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں اپنی امت پر یا لوگوں پر اس کو گراں نہ سمجھتا تو انھیں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

یہ حدیث مسواک کی سنیت پر دو طریقہ سے دلالت کرتی ہے ایک تو یہ کہ اگر مسواک کرنا واجب اور ضروری ہوتا تو حضور ﷺ اس کا ضرور حکم کرتے چاہے مشقت ہو یا نہ ہو۔ اس کو امام شافعیؒ نے ذکر کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ ''لأمرتهم'' کا لفظ خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ مسواک سنت ہے، اس لیے

آپ ﷺ نے مسواک کرنے کا حکم نہیں فرمایا۔

۲:- حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے دس چیزوں کو فطرت میں سے شمار کیا ہے (یہ حدیث ماقبل میں گزر چکی ہے) اس میں مسواک بھی ہے، اور فطرت کا معنی سنت ہے، لہٰذا مسواک سنت ہوگی نہ کہ واجب۔

۳:- نیز مسواک نظافت کے قبیل سے ہے اور نظافت مستحب ہے، لہٰذا مسواک بھی سنت ہوگی۔

قائلین وجوب کے دلائل اور ان کا تسلی بخش جواب

۱:- حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث **لولا أن أشق علی أمتي لأمرتهم بالسواک عند کل صلوٰۃ** سے قائلین وجوبِ مسواک دو طریقہ سے استدلال کرتے ہیں: ایک تو مستحب ہونے کے باوجود امر کی نفی کرنا، اگر مسواک مستحب ہوتی تو یقیناً امر کی نفی کرنا درست نہ ہوتا، دوسرے امر کو مشقت قرار دینا جو بلاشبہہ وجوب ہی کی صورت میں پائی جاتی ہے، اس لیے کہ مندوب اور مستحب ہونے میں کوئی مشقت اور بار نہیں کیونکہ اس کا ترک جائز ہے۔

۲:- حضرت عائشہؓ کی حدیث **السواک مطهرة للفم مرضاة للرب** کہ مسواک منھ کی صفائی اور اللہ رب العزت کی خوشنودی کا ذریعہ ہے، مسواک کو رضاء الٰہی کا سبب قرار دینا اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس کے خلاف کرنا اور مسواک کو ترک کرنا اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنا ہے اور اللہ کی ناراضگی ترک وجوب پر ہے نہ کہ ترک سنت پر، لہٰذا معلوم ہوا کہ مسواک کرنا واجب ہے۔

۳:- حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وہ حدیث ہے جس میں حضور ﷺ کا مسواک کے متعلق معمول بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ رات اور دن کے کسی حصہ میں نیند سے بیدار ہوتے تو مسواک ضرور فرماتے۔ آپ ﷺ کا یہ دائمی عمل وجوب مسواک پر علی الاعلان دلالت کرتا ہے۔

مذکورہ دلائل پر مناقشہ اور اس کا جواب:

پہلی دلیل کا جواب بقول حافظ ابن حجرؒ یہ ہے کہ ابوہریرہؓ کی مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے وقت مسواک کرنا عندالشرع محبوب ہے اور رسول اللہ ﷺ کا مطلوب بھی ہے، شارعؑ نے حدیث کے ذریعہ صرف اس کی اطلاع دی ہے، حکم نہیں کیا ہے، نیز ماقبل میں امام شافعیؒ کا جو قول گزر چکا ہے کہ مسواک کرنا اگر واجب ہوتا تو اس کا حکم ضرور دیا جاتا خواہ اس میں مشقت ہو یا نہ ہو، وہ

خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسواک کرنا واجب نہیں ہے۔

دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث وجوب مسواک پر دلالت النص کے طور پر دلالت کرتی ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث سنیت مسواک پر عبارت النص کے طور پر دلالت کرتی ہے، اور استدلال بعبارۃ النص کو استدلال بدلالت النص پر فوقیت حاصل ہے، لہٰذا ابو ہریرہؓ کی حدیث کو حضرت عائشہؓ کی حدیث پر ترجیح حاصل ہوگی اور مسواک کا مستحب ہونا وجوب کے مقابلہ میں اعلیٰ اور افضل ہوگا۔

تیسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث بقول حافظ ابن حجرؒ ضعیف ہے۔

صحیح یہی ہے کہ مسواک کرنا سنت ہے نہ کہ واجب، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ نے اس پر امت کو ترغیب ہے اور انھیں ترغیب دینے کے ساتھ خود اس پر پابندی فرمائی ہے، نیز مسواک کو خصال فطرت سے شمار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ مسواک واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔

پانچویں بحث
مسواک کے مسنون اوقات کے بیان میں

ماقبل میں یہ بات عرض کی جاچکی ہے کہ مسواک کرنا سنت موکدہ ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے اس پر مواظبت فرمائی ہے اور قولاً وفعلاً امت کو اس کی ترغیب بھی دی ہے، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اوقات اور مقامات کا بھی تذکرہ کر دیا جائے جن میں مسواک کرنا افضل اور مسنون ہے۔

احناف اور اوقات مسواک:

احناف کے نزدیک درج ذیل اوقات میں مسواک کرنا سنت ہے:

۱:- وضو کے وقت

۲:- نماز کے وقت

۳:- تلاوت قرآن کے وقت

۴:- نیند سے بیدار ہونے کے بعد

۵:- گھر میں داخل ہونے کے بعد

۶:- لوگوں کے اجتماع کے وقت

۷:- منھ میں تغیر اور دانتوں کے پیلا ہونے کے وقت

مالکیہ اور اوقات مسواک:

۱:-وضو کے وقت

۲:-نماز کے وقت

۳:-قراءت قرآن کے وقت

۴:-نیند سے اٹھنے کے بعد

۵:-منہ میں بو ہونے کی صورت میں

۶:-طویل خاموشی کے بعد

۷:-کثرت کلام کے وقت

۸:-بو اور مہک والی شے کے کھانے کے بعد

شوافع اور مقامات مسواک:

۱:-وضو کے وقت

۲:-نماز کے لیے کھڑے ہونے کے وقت

۳:-تلاوت قرآن اور قراءت حدیث کے وقت

۴:-فقہ پڑھنے کے وقت

۵:-ذکر اللہ کے وقت

۶:-نیند سے اٹھنے کے بعد

۷:-منہ کے اندر مہک ہونے کے وقت

۸:-کھانے کے وقت

۹:-بھوک کی حالت میں

۱۰:-لمبی خاموشی کے بعد

۱۱:-لمبے کلام کے بعد

حنابلہ اور اوقات مسواک:

۱:-وضو کے وقت

۲:-نماز کے وقت

۳:-مسجد میں داخل ہونے کے وقت

۴:-تلاوت قرآن کے وقت

۵:-نیند سے بیدار ہونے کے بعد

۶:-گھر میں داخل ہونے کے وقت

۷:- طویل خاموشی کے بعد

۸:-دانتوں کے پیلے ہونے کے وقت

۹:- معدہ خالی ہونے کے وقت

مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فقہاء اربعہ پانچ حالتوں میں مسواک کے مسنون ہونے پر متفق ہیں۔

۱:-وضو کے وقت:- کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا اگر میری امت پر دشوار نہ ہوتا تو میں انھیں ہر وضو کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا **لو لا أن أشق على امتي لأمرتهم بالسواک عند کل وضوء**

۲:-نماز کے لیے کھڑے ہونے کے وقت:- **لو لا أن أشق على أمتي أو على الناس لأمرتهم بالسواک مع کل صلوٰة** کی وجہ سے

۳:-نیند سے بیدار ہونے کے بعد:-حضرت حذیفہؓ کی حدیث "**کان النبي ﷺ إذا قام من اللیل یشوص فاه بالسواک**" کی وجہ سے، کہ آپﷺ جب نیند سے بیدار ہوتے تو اپنے منھ کو مسواک سے صاف کرتے۔

۴:-منھ میں بو اور دانتوں کے پیلے ہونے کے وقت:-اس کی بنیاد حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے، حضورﷺ نے فرمایا کہ **السواک مطهرة للفم و مرضاة للرب** کہ مسواک منھ کی صفائی کا آلہ اور رب کی خوشنودی کا سبب ہے۔

۵:-دخول بیت کے وقت:-حضرت عائشہؓ کی اس حدیث کی وجہ سے جس میں حضورﷺ کا معمول بیان کیا گیا ہے کہ آپﷺ جب بھی گھر میں داخل ہوتے تو سب سے پہلے مسواک فرماتے۔ **کان إذا دخل بیته بدأ بالسواک.**

اعیان الحجاج سے ماخوذ

مشاہیر کرام کے واقعات حج

از: محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

مفتی سعد اللہ مراد آبادی ۱۲۱۹ھ میں پیدا ہوئے، فقہ کے علاوہ نحو ولغت کے بھی نہایت جید عالم تھے، مفتی صدر الدین صاحب کے شاگرد تھے، دہلی سے ۱۲۴۳ھ میں لکھنؤ آئے اور مرزا حسن علی محدث اور مفتی ظہور اللہ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا، مدرسہ سلطانیہ لکھنؤ میں تدریس کی خدمت انجام دی، پھر سرکاری طور پر شعبۂ تالیف کے ناظر مقرر ہوئے اور ان کی نگرانی میں تاج اللغات کی کچھ جلدیں مکمل ہوئیں، اس کے بعد ۲۹ سال افتاء کی خدمت انجام دی۔

۱۲۷۰ھ میں سفر حج کیا، دھولیہ پہنچ کر رفقاء کی خواہش پر زاد السبیل تصنیف کی، جس میں مناسکِ حج کا بیان ہے، حجاز میں شیخ الحرم شیخ جمال حنفی سے حدیث کی سند لی، واپسی کے بعد مزید تین سال لکھنؤ میں مفتی رہے، جب واجد علی خاں معزول کردیے گئے تو نواب یوسف علی خاں نے ان کو رام پور بلالیا، وہاں تازندگی عہدۂ افتاء پر قائم رہے۔ کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں، نوادر الاصول شرح فصول اکبری سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

۱۲۹۴ھ میں وفات ہوئی، زاد السبیل کا نسخہ بھی میرے کتب خانہ میں ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ حضرات دیوبند کے شیخ الحدیث شاہ عبد الغنی نے جس طرح آشوب دہلی کے وقت ہجرت اختیار کی تھی، اسی طرح جنگ شاملی کے بعد ان کے شیخ الطریقہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب بھی ہجرت کر گئے تھے۔ مولانا رشید احمد، مولانا نانوتوی اور مولانا تھانوی وغیرہم حاجی صاحب کے جلیل القدر خلفاء میں ہیں۔ مولانا تھانوی اور دوسرے بہت سے خلفاء نے حجاز ہی میں سلوک کے منازل طے کیے ہیں، حضرت حاجی صاحب کی وفات ۱۳۱۷ھ میں ہوئی۔

مولانا عبد الحی لکھنوی مولانا عبد الحی بن مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی ۱۲۶۴ھ میں بمقام باندہ پیدا ہوئے، دس سال کی عمر میں حافظ ہوئے، حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ خوشنویسی بھی سیکھ لی اور فارسی کی

کچھ کتابیں پڑھ ڈالیں، سترہ برس کی عمر میں تمام علوم متداولہ سے فراغت حاصل کر کے تصنیف وتالیف میں مشغول ہوگئے۔

۱۲۷۹ھ میں پہلی دفعہ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ حج وزیارت کے لیے گئے، رجب میں حیدرآباد سے روانہ ہوئے، اورشعبان میں بمبئ سے بادبانی کشتی پر سوار ہوئے، یکم رمضان کو حدیدہ پہنچ کر دس دن قیام کیا، وہاں سے چلے تو ہوا مخالف تھی، جہاز طوفان میں پڑ گیا اور جدہ میں اترنا ممکن نہ ہوا، اس لیے لیث میں اتر پڑے اور وہاں سے براہ خشکی چار دن میں مکہ پہنچے، ادائے حج تک مکہ میں قیام ہوا، ذی الحجہ کے آخری عشرہ میں مدینہ کے لیے روانہ ہوائے، ۲؍محرم ۱۲۸۰ھ کو مدینہ پہنچنے، ۸ دن قیام کر کے ۱۰؍محرم الحرام کو مکہ روانہ ہوئے، پھر مکہ سے دس صفر کو چلے اور جدہ سے بادبانی جہاز میں بیٹھ کر ربیع الاول کے درمیانی عشرہ میں بمبئ پہنچے اور جمادی الاولیٰ کے شروع میں داخل حیدرآباد ہوئے، تقریباً گیارہ مہینے میں یہ سفر پورا ہوا۔

دوسری بار ۱۲۹۲ھ میں تنہا حج کے لیے گئے(۱)، حیدرآباد سے ۱۰؍شوال کو روانگی ہوئی اور بمبئ سے دخانی جہاز ۲۱؍شوال کو چلا اور ۵؍ذیقعدہ کو جدہ پہنچا، ۱۰؍کو مکہ آئے، اس سال جمعہ کو حج ہوا تھا، حج کے بعد ۲۱؍ذی الحجہ کو مدینہ کی زیارت کو نکلے، ۱۵؍محرم ۱۲۹۳ھ کو حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، وہاں دس دن رہ کر ۱۵؍کو مکہ روانہ ہوئے، چند روز قیام کیا، پھر جدہ سے ۸؍صفر کو جہاز میں سوار ہوئے، ۲۱؍صفر کو جہاز بخیر وعافیت بمبئ پہنچا۔

مولانا عبدالحی نے سفر میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددی وغیرہ سے حدیث کی سند حاصل کی۔

مولانا نے بکثرت درسی کتابوں پر حواشی لکھے ہیں، جن سے مدرسین وطلبہ آج تک فائدہ اٹھا رہے ہیں، حواشی کے علاوہ سعایہ، الفوائد البہیہ، النافع الکبیر اور کئی رسائل کے مجموعے نہایت مفید ہیں۔ طالب علمی کے دور کے علاوہ فراغت کے بعد بھی مولانا کی تصنیفات سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ مولانا عبدالحی کی وفات ۱۳۰۴ھ میں ہوئی۔

مولانا محمد طاہر صاحب | آپ پورہ معروف ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے تھے، آپ نے مولانا سخاوت علی جونپوری سے علوم ظاہری اور مولانا کرامت علی جونپوری سے فیوض باطنی حاصل کیے، مولانا کرامت علی سے آپ کو اجازت بیعت بھی حاصل تھی، طب میں آپ کا بڑا شہرہ تھا، حدیث وفقہ میں

(۱) اسی سفر میں مولانا کی ملاقات رابغ میں مولوی نصر اللہ خاں سے ہوئی تھی۔

بھی مہارت حاصل تھی، اعلیٰ درجہ کے خوشنویس بھی تھے، ان علمی کمالات کے علاوہ جسمانی طاقت میں بھی شہرۂ آفاق تھے۔ ۱۲۶۰ھ میں آپ نے حجاز کا سفر کیا، اور اسی سفر میں حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب سے جو اس وقت ہجرت کر کے مکہ معظّمہ میں مقیم تھے، حدیث کی کچھ کتابیں پڑھی ہیں، اور شاہ صاحب نے ان کو سند لکھ کر عطا فرمائی ہے، آپ کی وفات ۱۲۹۶ھ میں ہوئی، آپ کے سوانحِ حیات پر ایک مستقل کتاب ''حیات مولانا محمد طاہر'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

مولانا عبداللہ صاحب مئو ضلع اعظم گڈھ کے مشہور اور جید علماء میں تھے، مدرسۂ غفاریہ (رسڑا) میں مولانا تراب علی لکھنوی المتوفی ۱۲۸۱ھ سے، اور غالباً جونپور میں مولانا عبدالحلیم لکھنوی المتوفی ۱۲۸۵ھ سے کتب درسیہ کی تحصیل کی، مولانا ایک ماہر طبیب تھے، منطق وفلسفہ میں بھی بڑا دخل تھا، اس کے ساتھ ہی حدیث وفقہ سے بھی انتہائی شغف تھا، منطق میں ایک رسالہ ''عرفان العرفان'' آپ کی یادگار ہے، جس کا ذکر مولانا عبدالحلیم نے اپنے ایک مکتوب میں اور مولانا عبدالحی نے حاشیہ میر زاہد ملا جلال میں کیا ہے، آپ نے کئی برس تک نوانگر ضلع بلیا میں درس دیا۔ اخیر میں اپنے مکان پر مطب کرتے تھے، ۱۲۸۶ھ میں آپ نے سفر حج کیا، اور اسی سال مدینہ منورہ میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کی خدمت میں اوائل بخاری وترمذی پڑھ کر علم حدیث کی سند حاصل کی، آپ نے ۱۳۲۱ھ میں انتقال کیا۔

نواب سید صدیق حسن خاں ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے، مختصر المعانی تک اپنے بڑے بھائی کے پاس اور قطبی مع میر وغیرہ دوسرے علماء کے پاس پڑھ کر گھر چھوڑ دیا، اور چند سال کانپور وفرخ آباد میں پڑھتے رہے، آخر میں مفتی صدرالدین خاں صاحب صدرالصدور دہلی کے پاس حاضر ہو کر تکمیل علوم کی، حدیث میں وہ ایک ایک واسطہ سے شاہ عبدالعزیز اور شوکانی کے شاگرد ہیں۔ ۱۲۸۷ھ میں نواب شاہ جہاں بیگم والی ریاست بھوپال ان کے عقد نکاح میں آئیں اور انھوں نے ان کو نائب دوم کا عہدہ اور چوبیس ہزار سالانہ کی جاگیر عطا کی۔ بعد میں نواب والا جاہ امیر الملک کا خطاب اور پچاس ہزار کی جاگیر عطا ہوئی۔

۱۲۸۵ھ میں حج کیا، اس سفر کے مختصر حالات انھوں نے اتحاف النبلا اور ایضاح المحجہ میں لکھے ہیں، فرماتے ہیں:

''بندۂ شرمندہ ۲۷؍شعبان ۱۲۸۵ھ میں نماز ظہر کے بعد گھر سے بارادہ فریضہ حج باہر نکلا، بارہ دن بمبئی میں رہا، ۹؍رمضان کو نماز عصر سے پہلے فتح سلطان نامی جہاز میں بیٹھا، جب لنگر اٹھایا گیا، ہوا

اچھی تھی، قریب ساٹھ مرحلے کے ایک دن میں طے ہوگیا، پھر ہوا رک گئی، تین دن تک جہاز نہ چلا، خدا خدا کر کے ۱۲؍رمضان کو ہوا چلی، جب سوار ہوا تھا تین دن تک دردِ سر رہا، قے ہوا کی، چوتھے دن کچھ ہوش درست ہوئے، اس جہاز میں تین سو آدمی تھے، وضو و غسل سمندر کے پانی سے اور کھانا، پینا میٹھے پانی سے جو ساتھ میں رکھ لیا، ہوتا تھا، ۱۷؍رمضان کو باب سکندر (باب المندب) سے گزر ہوا، ۲۶؍رمضان کو جہاز حدیدہ میں لنگر انداز ہوا، یہاں بارہ دن مقام ہوا، ابھی ہمارے حساب سے ۲۸ ہی تاریخ تھی کہ وہاں رویت ہلال ٹھہر گئی، چار ناچار اہل بندر کے ساتھ اتفاق کرنا پڑا، قضا کا روزہ رکھا، عید گاہ میں دو ہزار کے قریب آدمی آئے ہوں گے (جہاز میں اور یہاں قلمی رسائل کرتے رہے) ۱۰؍شوال کو جہاز میں آنا ہوا، سترہ شوال کو لنگر اٹھا، مجموعی قیام اس جگہ کا ۱۸؍دن ہوا، جب جہاز چلا، راہ میں ہوا بند ہوگئی، تین دن تک کھڑا رہا، جب ہوا چلی، تو رات کو ابر و باراں آ گیا، دن کو جتنا چلتا، رات کو اتنا ہی بہ سبب ہوائے مخالف کے پلٹ آتا، کچھ نہ پوچھو کیا حال ہوا، نہ پانی باقی ہے نہ کھانا، ایک وقت آدھ پاؤ کھچڑی دو ایک گھونٹ پانی کے بمشکل ملتے تھے، دم گھٹ کر ناک میں آ گیا، حصن حصین کا ختم کیا، ہوا چلی، جہاز روانہ ہوا، ایک رات جہاز کسی پہاڑ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا، وہ رات شب ہجر سے بھی زیادہ سیاہ و سخت و دراز تھی، سنیچر کے دن جہاز میں ذی قعدہ کا چاند دکھائی دیا، ۴؍ذی قعدہ کو سامنا یلملم کا ہوا، بعد نماز فجر نہا دھو کر عمرہ کا احرام باندھا، تمتع کی نیت کی، خدا خدا کر کے ۹؍ذی قعدہ کو بندر جدہ پر لنگر ہوا، جان میں جان آ گئی، سات دن کا راستہ حدیدہ سے جدہ تک قریب ایک ماہ میں طے ہوا، بمبئی سے تخمیناً دو ماہ میں جدہ پہنچنا ہوا، یہاں تین دن مقام کیا، ۱۴؍کو محصول جمرک دے کر بعد مغرب روانہ ہوئے، حمالوں نے حدّہ لے جا کر ڈال دیا، وہاں جمع بین الظہرین کر کے آگے بڑھے، آدھی رات کو سید ابوبکر مطوف کے ساتھ باب السلام سے مسجد الحرام میں داخل ہوئے، اعمال عمرہ ترتیب وار ادا کیے، بھیڑ نہ ہونے کی وجہ سے حجر اسود کا بوسہ ہر چکر میں بخوبی میسر ہوا، خانہ کعبہ پر نظر پڑتے ہی ساری تکلیف راہ و مصائب سفر و متاعب بحر و بر بھول گئے۔ سعی کے بعد باقی شب حرم میں بسر کی، اول وقت مصلائے شافعی پر فجر پڑھ کر منزل پر آنا ہوا۔ ۲۹؍ذی قعدہ کو قاضی کے سامنے چاند دیکھنے کی شہادت گزری، مگر میں نے یا کسی مسافر نے چاند نہیں دیکھا۔

۸؍ذی الحجہ کو احرام حج باندھ کر منیٰ تک پیادہ پا گیا، وہاں سے عرفات تک سوار ہوا، عرفات میں قبل وقوف ساری حزب الاعظم پڑھی، بعد غروب مزدلفہ کی طرف کوچ کیا، عرفات و منیٰ میں باوقات فرصت کتابت بھی کی، ۱۳؍ذی الحجہ کو منیٰ سے مکہ آنا ہوا۔

۱۵رصفر ۱۲۸۶ھ کو قافلہ مدینہ کی طرف چلا، خلاف عادت بیس دن میں پہنچا، ایک ہفتہ قیام ہوا، حضور مسجد نبوی مع زیارت مرقد مطہر و دیگر مزارات بقیع وشہداء احد وغیرہ مساجد وچاہ ومسجد وغیرہا میسر آیا، واپسی میں خاص مدینہ منورہ سے عمرہ کا احرام باندھا، بارہ دن میں قافلہ مکہ پہنچا، اس وقت بھی نصف شب تھی، مطاف ومسعی کو خالی پایا اور اس کو غنیمت باردہ سمجھا، جملہ مدت جوار بیت اللہ واقامت مکہ ومدینہ کی قریب چاہ ماہ تھی، سچ تو یہ ہے کہ ؎

اوقات ہماں بود کہ بادوست بسر شد   باقی ہمہ بے حاصلی و بے خبری بود

محلّہ ہندی میں قیام تھا، حرم میں آنے جانے کے لیے باب الزیادہ تھا۔

واپسی میں فیض الباری نام جہاز ملا، اس میں نوسو آدمی تھے، اس کا لنگر بھی حدیدہ میں تین دن رہا، اس بندر کا معبر نہایت بدتر ہے، وہاں سے چل کر عدن تک ایسی گرمی ہوئی کہ سارے بدن پر دانے ہوگئے، عدن سے آگے بارش کا موسم ملا، قریب بمبئی طوفان نے جہاز کو تہ وبالا کرنا شروع کردیا، موج کی گولہ باری سے ہوش وحواس غلط ہوگئے، بائیس دن میں جدہ سے بمبئی پہنچنا ہوا، وہاں اوائل جمادی الاولیٰ میں بمشکل تمام بوجہ بارش عام بھوپال تک آنا ہوا، ساری مدت اس سفر کی آٹھ ماہ ہے (ایضاح المحجہ)

نواب صاحب کی تصنیفات بہت ہیں، اور عربی وفارسی وار دو تینوں زبانوں میں ہیں، آخر آخر میں رئیس کے خاندان والے نواب صاحب کا عروج دیکھ نہ سکے اور وہ درپے آزار ہوگئے، اس لیے ان کو جیسا عروج حاصل ہوا تھا ویسا ہی ابتلاء بھی پیش آیا، ۱۳۰۷ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۴۴ھ میں ہوئی، مولانا مملوک العلی کے پاس درسیات کا اکثر حصہ پڑھا، مفتی صدرالدین صاحب سے بھی علوم عقلیہ کا درس لیا، اور صحاح ستہ قریب قریب کل حرفاً حرفاً حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کے پاس پڑھا، شاہ احمد سعید صاحب بھی آپ کے اساتذہ میں تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے اجل خلفاء میں تھے، علوم حدیث وفقہ میں کمال مہارت کے ساتھ ساتھ ذکر وعبادت، تقویٰ طہارت اور اصلاح وتربیت میں ان کا کوئی ہم سران کے زمانہ میں نہ تھا۔ ان کے تلامذہ ومریدین اور دیگر حالات وواقعات کی تفصیل تذکرۃ الرشید میں پڑھیے، مجھے اس جگہ صرف آپ کے حج اور سفر حج کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔

حضرت نے تین حج کیے ہیں، حج فرض کے علاوہ آپ نے دو حج بدل (ایک اپنے والد

بزرگوار کی طرف سے اور ایک مادر محترمہ کی جانب سے) کیے ہیں۔

آپ نے پہلا حج ۱۲۸۰ھ میں کیا ہے، اس سن کے اوائل میں آپ رام پوری قافلہ کے ساتھ بمعیت حکیم ضیاء الدین رام پوری کراچی کی طرف روانہ ہوئے، آپ کے ماموں زاد بھائی مولوی ابوالنصر صاحب بھی ساتھ تھے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کہتے ہیں کہ:

''اس زمانہ میں حج کا سفر اس زمانہ کا سفر حج نہ تھا کہ گھر سے باہر نکل کر ریل میں بیٹھے تو تیسرے دن بمبئی اور بمبئی سے دخانی جہاز میں بیٹھے تو بارہویں دن باب الحرمین یعنی جدہ کا بندرگاہ دکھائی دینے لگا۔ اس وقت کی سہولت وراحت کو اس وقت کی صعوبت ومشقت کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو زمین وآسمان کا فرق معلوم ہوتا۔ اور یوں سمجھ میں آتا ہے کہ حج کا فریضہ ادا میں جس قدر دشوار تھا، اتنی مشکل کوئی عبادت نہ تھی، ہفتوں چھکڑا اور بہلیوں میں بیٹھنا پڑتا تھا، جن کے ہچکولوں سے ہڈیوں کا چورا ہوتا تھا، مہینوں پانی میں چلنا پڑتا تھا، دریائی سفر بڑی کشتیوں میں طے کیا جاتا تھا، جن کو بغلہ کہتے ہیں، بغلہ میں بقدر وسعت تیس چالیس آدمی بیٹھتے اور مرطوب ہوا کے جھونکوں سے دوران سر میں مبتلا ہوکر ایک دوسرے پر جا جا پڑتے تھے، اٹھتے تو چکر اور استفراغ بیہوش بناتا، اور پڑتے تو غشی کا بادل چھاتا چلا جاتا تھا، یہ بغلے بادبانوں کے ذریعہ سے ہوا کے رخ پر چلائے جاتے تھے، جن کو ملاح کھیتے اور دن بھر چلا کر شام کے وقت کسی بستی کے قریب کنارے پر باندھ دیا کرتے تھے، اس وقت مدہوش پڑی ہوئی سواریاں اٹھا کرتیں، گھاس پھونس سے کچی پکی کھچڑی تیار ہوتی اور اللہ عزیز کر کے کھالی جاتی تھی۔ وقت ملتا تو دن بھر کے تھکے ماندے کچھ تکان رفع کرتے، ورنہ یونہی پڑے آسمان کو تکتے رہتے تھے، صبح سے قبل ٹھنڈے وقت جُھک پٹے میں اس چھوٹے جہاز کا لنگر پھر کھول دیا جاتا تھا، خدا خدا کر کے بندرگاہ کا کنارہ نظر آتا اور خشکی پر اترنا نصیب ہوتا تھا، کراچی سے پھر بادبانی جہاز کا سفر ہوتا تھا، جو عموماً بمبئی کے بندرگاہ سے مال بھرتا ہوا عدن ومکلا وصنعاء ومخہ اور یمن کے دیگر بندرگاہوں پر ٹھہرتا مال چڑھاتا اتارتا جدہ پہنچا کرتا تھا، چونکہ اس جہاز کا ظاہری دارومدار مضبوط کپڑے کے پردوں یعنی ان بادبانوں پر تھا جن کو ہوا کے رخ پر باندھا جاتا تھا کہ ہوا کہ تند جھونکے ان سے ٹکرا کر جہاز کو پانی میں کاٹتے ہوئے آگے کو دیکھ لیں، اس لیے اول تو قطع مسافت میں زمانہ زیادہ گزرتا تھا اور دوسرے ہوا کے رخ بدل جانے پر جہاز بھی اپنا منھ پھیر لیتا تھا، اکثر ایسے اتفاقات سننے میں آئے ہیں کہ چلتے چلتے جدہ کا کنارہ نظر آیا اور ہوا پلٹی تو جہاز کی الٹی رفتار اور پچھلے پاؤں لوٹنے سے بمبئی کا کنارہ دکھائی دینے لگا ہے۔ ان بیچارے مسافروں پر

جن کو نیچے پانی اور اوپر آسمان کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا ایسے حسرت ناک وقت میں جو کچھ گزرتا ہوگا وہ انھیں کا دل جانتا ہے، آج تو بحری و بری ہر دو سفر دخانی قوت سے بفضل اللہ اس درجہ سہل ہو گئے کہ پچھلی مشقت کا سمجھنا بھی دشوار ہو گیا، بادی جہازوں میں عموماً ہندوستان سے جدہ تک پہنچنا تین چار ماہ میں ہوتا تھا ہاں اگر تقدیر یاوری کرتی تھی تو بعض دفعہ دخانی جہاز سے بھی وقت کم صرف ہوتا اور چھٹے ساتویں دن ہی موافق ہوا کے تیز دھکے بھاری اور بڑے سے بڑے جہاز کو جدہ پہنچا دیتے تھے۔

اس مشقت والے سفر کے زمانہ میں حضرت امام ربانی قدس سرہ کو بمعیت رامپوری جماعت کثیرہ کے اس پہلے سفر حج کا اتفاق ہوا جس کو حج فرض کہا جاتا ہے، چنانچہ آپ فیروز پور تک چھکڑے میں بیٹھے اور وہاں سے کشتیوں میں بہاولپور کے نیچے کو گزرتے ہوئے حیدرآباد سندھ پہنچے، وہاں سے بغلہ میں سوار ہو کر کراچی بندر آئے اور کراچی سے بغلہ ہی کی سواری میں بمبئی تک پہنچے، آپ کے ناز پروردہ جسم اور نازک بدن نے اس کٹھن سفر کی ساری مشقتیں راحت سمجھ کر برداشت کیں، سارے سفر میں آپ کی ایک نماز بھی قضا نہیں ہونے پائی، آپ سفر میں بھی اسی طرح اپنے خدا کی یاد میں لگے رہے جیسا کہ حضر کی حالت میں وطن کے اندر لگے ہوئے تھے، سفر کی وہ پریشانیاں جو مسافروں کو گھبرا دیا کرتی ہیں آپ پر کچھ بھی اثر نہ ڈال سکیں، آپ ہر ناکامی میں ایسے ہی بشاش و مسرور رہے جیسا کامیابی پر ہونا چاہئے تھا، دقت یا تکلیف کا جو مضمون بھی پیش آتا چونکہ آپ سمجھتے تھے کہ حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہے اس لیے کبھی اس سے اکتاتے نہ تھے، الغرض جہاز آیا اور کرایہ طے ہو گیا، سب نے ٹکٹ لے لیے اور جہاز پر سوار ہو گئے، سواریاں سوار ہو کر منتظر تھیں کہ جہاز لنگر اٹھائے، آفتاب غروب ہو گیا، مگر جہاز نے لنگر نہ اٹھایا، انتظار کی تکلیف برداشت ہونا آسان نہیں ہے۔ روانگی میں اتنی تاخیر کا ہونا تھا کہ چاروں طرف پریشانی چھا گئی کہ دیکھئے جہاز کب لنگر اٹھائے گا اور کب روانہ ہوگا، اسی حالت پر کئی دن گزر گئے اور لوگوں کا انتشار پر انتشار بڑھتا رہا، کئی دن تک کنارے پر بندھے ہوئے جہاز میں بیٹھے بیٹھے سب اکتا گئے، حضرت امام ربانی کے سوائے جہاز کا کوئی مسافر ایسا نہ تھا جو کم و بیش پریشان خاطر نہ ہوا ہو، حضرت امام ربانی نے جب رفقاء کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا: ''میاں گھبراتے کیوں ہو، جہاز چوتھے روز روانہ ہوگا''۔ خدا خدا کر کے چوتھا دن آیا تو اس کے پل پل اور لحظہ لحظہ پر مسافروں کی نگاہ تھی کہ دیکھئے آج بھی روانگی ہوتی ہے یا نہیں، آخر آدھا دن گزرنے پر بھی جب روانگی کا کوئی اثر و نشان نہ پایا تو لوگوں نے حضرت سے عرض کیا کہ آج تو چوتھا دن تھا، لیجئے آج بھی رہے، تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کپتان نے لنگر

کھلوا کر جہاز چھوڑ دیا۔ بسم اللہ مجرہا و مرسٰھا کی آوازیں جہاز میں گونج اٹھیں۔

چھوٹا سا جہاز یعنی بغلہ جس وقت کراچی سے روانہ ہوکر بسوئے بمبئی جارہا تھا، کنارہ چھوڑے ہوئے عرصہ گزر گیا تھا کہ دفعۃً غلیظ ابرآسمان پر نظر آیا جو کہ آگے بڑھتا اور اوپر چڑھتا بغلہ کے سر پر آٹھہرا اور برسنا شروع ہوا، تند ہوا کے تھپیڑوں نے بغلہ کو ہلا دیا اور ٹھنڈے پڑے پانی میں جوش پیدا کردیا۔

سمندر میں تلاطم پیدا ہوگیا اور اطمینان سے بیٹھی ہوئی سواریوں کو ایک سخت طوفان نے آدبایا، جہاز کے ناخدا نے اول تو بادبانوں کے ذریعہ سے ہوا کی روک تھام کی، مگر جب جہاز کی حفاظت قابو اور اختیار سے باہر ہوگئی تو مایوس ہوگیا، تھک گیا، اور یہ الفاظ کہے کہ ''حاجیو! دعا مانگو طوفان آگیا'' طوفان کا نام ہی ایسا موحش ہے کہ انسان گھبرا اٹھتا ہے، اور جن پر بحری سفر کے وقت یہ حالت گزری ہو ان کی سراسیمگی کا تو پوچھنا ہی کیا؟ اس دہشت ناک منظر کے وقت جب کہ سمندر کی موجیں پہاڑ بن بن کر جہاز کو تہ وبالا کرتی ہیں، بڑے بڑے باہمت بہادر گھبرا اٹھتے ہیں، بجلی کی چمک اور بادل کی کڑک اس ہیبت ناک نظارہ کا پیش خیمہ ہے اور تلخ وشور پانی میں ڈوب کر جان دینا نتیجہ وانجام، پھر بھلا بغلہ کی تو ہستی کیا۔

کراچی وبمبئی کے مابین طوفان کا آنا تھا کہ جہاز والوں کے چھکے چھوٹ گئے اور ناخدا تک کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، سواریوں میں ہلچل پڑ گئی، کسی طرف آہ وبکا اور گریہ وزاری اور کہیں وحشت وسراسیمگی اور سکوت وتحیر، جس کو دیکھیے پریشان حال اور جسے خیال کیجئے مضطرب وخائف، اس وقت امام ربانی قدس سرہ نے ارشاد فرمایا: ''بھئی کوئی مرے گا تو ہے نہیں، ہم تو کسی کے بلائے ہوئے جارہے ہیں، خودنہیں جارہے ہیں، یہ اطمینان کے کلمات حضرت نے غایت طمانینت کے ساتھ رفقاء سفر کو سنائے، مگر وہ تسکین وتسلی جو خداداد آپ کو حاصل تھی دوسروں کو حاصل ہونی دشوار تھی، اس لیے اضطراب رفع نہ ہوسکا، یہاں تک کہ تیسرے دن بادل پھٹ گیا، ہوا تھم گئی، تلاطم کمزور پڑ گیا اور جہاز اپنی اصلی رفتار پر چلنے لگا۔

جس وقت بغلہ اپنی حالت پر آگیا اس وقت حجاج کو اطمینان حاصل ہوا اور ناخدا نے وہ گھڑی دیکھی جس سے پتہ معلوم ہو کہ بغلہ کہاں چل رہا ہے اور طوفان کے طمانچوں سے راہ راست کتنی مسافت پر چھوڑ آیا ہے، ناخدا گھڑی دیکھ کر حیران ہوگیا اور سواریوں سے مخاطب ہوکر بولا کہ طوفان تمہارے سفر کا بڑا رفیق نکلا، آج اس وقت جہاز اس جگہ چل رہا ہے کہ معمولی ہوا میں آٹھ روز تک بھی یہاں نہ پہنچ سکتا، طوفان میں جہاز بالکل سیدھے راستہ چلا چند گھنٹوں میں تند ہوا نے چندروز کی مسافت قطع کرادی۔

چنانچہ بخیر وعافیت سارا قافلہ کئی بندرگاہوں پر ٹھہر کر جدہ پہنچا اور وہاں سے حضرت امام ربانی قدس سرہ تمام ہمراہیوں سمیت اونٹوں پر سوار ہو کر مکہ معظّمہ روانہ ہوئے۔

بلدۃ الحرام میں حج وغیرہ کے علاوہ اپنے شیخ برحق مرشد العرب والعجم اعلیٰ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے فیض صحبت کی جو جو نعمتیں آپ نے حاصل فرمائیں ان کا کسی کو علم ہی کیا ہے جو بیان کی جائیں، مختصر یہ ہے کہ جب تک آپ مکہ معظّمہ میں مقیم رہے فرطِ محبت کے باعث آپ کو اعلیٰ حضرت نے اپنے ہی پاس رکھا، حج کے لیے عرفات جاتے وقت آپ کا اونٹ اعلیٰ حضرت نے اپنے اونٹ کے متصل کیا اور منیٰ ومزدلفہ میں آپ اپنے ساتھ ہی لگائے رکھا۔

مکہ معظّمہ ہی میں آپ مقیم تھے کہ بدن مبارک میں خارش کا اثر محسوس ہوا اور دن بدن زیادتی ہوتی رہی، آپ جس لازوال دولت سے مالا مال ہونے کے لیے گنگوہ سے چلے تھے اس کے تحصیل کی مشغولیت اور حصول کی لذت (۱) نے مرض کے علاج کی طرف متوجہ ہی نہ ہونے دیا، مرض اندر ہی اندر بڑھتا اور بدن پر پھیلتا رہا، یہاں تک کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد سلطانی راستہ سے مدینہ منورہ جانے والا قافلہ تیار ہوا اور آپ اپنے رامپوری مجمع کے ساتھ بلدۃ الرسول کی جانب روانہ ہو گئے۔

مدینۃ الرسول میں داخل ہو کر روضۂ اطہر کی حاضری ہوئی جو دنیا میں آنے والے ہر مسلمان کا منتہائے مراد اور اقصیٰ مقصود ہے، اور پھر آپ اپنے شفیق استاذ شیخ العصر سیدنا مولانا شاہ عبدالغنی صاحب قدس سرہ کی زیارت سے مشرف ہوئے، یہاں کی چند روزہ حاضری میں جو بھرپور خزانے آپ کو حاصل ہوئے اس کی اطلاع بھی کسی دوسرے کو نہیں ہے، بیت اللہ شیخ طریقت کے گہربار دربار کا حضور تھا اور بیت الرسول میں شیخ شریعت کے سدا بہار گلزار کی گل چینی، غرض حرمین شریفین میں بیت اللہ وبیت الرسول کا جوار حاصل کرنے والے دونوں آفتاب و ماہتاب ہند مربی آپ کی ترقی مراتب کا وسیلہ بنے، آخر کار قافلہ کی واپسی کا وقت قریب آگیا اور مراجعت جماعت متعین ہوگئی، رامپوری قافلہ کے میر قافلہ ڈپٹی عبدالحق صاحب نے جنت البقیع کی پاک زمین سے علٰحدگی نہ چاہی، وہیں انتقال فرمایا اور قیامت تک کے لیے جوارِ رسول کے شرف سے بہرہ مند ہوئے، امام ربانی قدس سرہ معہ ہمراہیاں مکہ معظّمہ

(۱) ایک مرتبہ حضرتؒ فرماتے تھے کہ ''ہندوستان میں موذن برے بھلے ہر قسم کے رکھ لیے جاتے ہیں مگر عرب میں اونچی آواز والے خوش الحان موذن بنائے جاتے ہیں، اس کے بعد ایک موذن کا تذکرہ فرمایا کہ بڑے خوش الحان تھے، حرم شریف میں جس منارہ پر اذان دیتے تھے اس کے نیچے ہم رہتے تھے، وہ اوپر اذان دیا کرتے تھے اور ہم نیچے لوٹا کرتے تھے، اُس وقت ہمارے بدن پر خارش نکلی ہوئی تھی۔۱۲ از مولوی ولایت حسین

واپس ہوئے اور وہاں سے ہندوستان کی جانب مراجعت فرمائی۔ ۱۲۸۱ھ دو ماہ ہوئے شروع ہو چکا تھا، خارش جس کی ابتدا مکہ معظمہ میں ہو چکی تھی دن بدن روبترقی تھی، اول خشک تھی اب تر ہوگئی تھی، ابتداءً معمولی تھی اور اس وقت ہولناک بن گئی تھی، اسی حالت میں آپ جہاز پر سوار ہوگئے، جہاز پر سوار ہونا تھا کہ دفعۃً بخار چڑھا اور اتنا شدید کہ سرسام ہوگیا، تین دن تک بے ہوش رہے، دست جاری ہوئے اور اتنی تعداد میں کہ گنتی دشوار ہوگئی (اس کے بعد بیماری کی تفصیل، مولوی ابوالنصر صاحب کی غیر معمولی خدمت گزاری و تیمارداری کا ذکر ہے، جزاہ اللہ خیراً) حضرت کا مرض اس درجہ شدید ہوگیا تھا کہ صحت کا خیال محض وہم اور گمان ہی گمان رہ گیا تھا، بمبئی پہنچ کر علاج بھی ہوا اور پوری کوشش کے ساتھ ہوا، مگر رائی کے دانہ کے برابر مرض میں کمی نہ ہوئی، بمبئی میں ایک مہینہ قیام ہوا، مزید قیام قافلہ والوں کے لیے سخت دشوار تھا، ناچار وہاں سے روانگی ہوئی، کسارا تک ریل پر رامپوری قافلہ کے ساتھ آئے، ریل ابھی وہیں تک تھی، کسارا سے اندور تک دوسری سواریوں میں سارے قافلہ نے سفر کیا، اب یہاں سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ تھی، اس لیے کہ مریض کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی، قافلہ والوں کو کہہ دیا گیا کہ آپ لوگ جائیں، مولوی ابوالنصر حضرت کو لے کر اندور میں ٹھہر گئے اور کسی طرح حکیم محمد اعظم خاں دہلوی طبیب خاص مہاراجہ اندور مؤلف اکسیر اعظم کو سرائے میں جہاں قیام تھا لائے، حضرت کو دکھا کر ان کا علاج شروع کیا، غیبی امدادوں کا ایسا ایسا ظہور ہوا کہ باید وشاید، اسی اثناء میں سکندر جہاں بیگم والیۂ بھوپال کا اندور میں ورود ہوا، اور انھوں نے دوسو روپے بتقریب دعوت، اہلیہ ابوالنصر کو بھیجا، حکیم محمد اعظم کے علاج سے حضرت کو بہت نفع ہوا اور حکیم صاحب نے مولوی ابوالنصر صاحب کو مشورہ دیا کہ حالت قابل اطمینان ہے، اب بسم اللہ کرو اور وطن کو جاؤ، مگر دوا کا استعمال جاری رہے، چنانچہ اندور میں ایک ماہ قیام کے بعد وطن روانہ ہوئے، کچھ گوالیار میں قیام ہوا اور وہاں سے چل کر میرٹھ میں ٹھہرے، اس کے بعد بخیر وعافیت گنگوہ پہنچے، اوائل ۱۲۸۰ھ میں حج کو تشریف لے گئے، اور محرم ۱۲۸۲ھ میں وطن واپس ہوئے۔

(دوسرا حج) ۱۲۹۴ھ وہ سال تھا جس میں ٹرکی وروس میں جنگ چھڑی ہوئی تھی اور طبعاً ہر مسلمان ٹرکی کی فتح یابی کا متمنی تھا، اسی سال حضرت نے حج کا قصد فرمایا، جس وقت دیگر حضرات کو خبر ہوئی تو سرزمین ہند کے چیدہ علماء سب ہی معیت کے لیے تیار ہوگئے، مشاہیر علماء میں آپ کے علاوہ حضرت مولانا محمد قاسم، حکیم ضیاء الدین، مولانا محمد مظہر مع اہلیہ، مولانا رفیع الدین دیوبندی، مولانا محمود حسن، حکیم محمد حسن، مولوی حکیم محمد اسماعیل، مولانا محمد منیر، مولوی احمد حسن کانپوری مع اہلیہ وغیرہم شریک

کارواں تھے، پورا قافلہ سو سے اوپر کا تھا، مولانا محمود حسن، حکیم محمد حسن اور مولانا رفیع الدین ۷؍شوال کو وطن اور دیوبند سے روانہ ہوکر بمبئی پہنچ گئے، اور حضرت گنگوہی ۱۴؍شوال کو سہارنپور میں ریل پر سوار ہوئے، اس سال ریل بمبئی تک جاری ہوگئی تھی، اور بمبئی سے جدہ تک آگبوٹ (اسٹیمر) چلنے لگے تھے، غازی آباد میں ریل بدلی جاتی تھی اور پھر الہ آباد سے کلکتہ لائن چھوڑ کر جبل پور دوسری گاڑی میں بیٹھنا پڑتا تھا، جبل پور سے بمبئی تک ریل کا سلسلہ قائم تھا۔ دو گاڑیاں چلتی تھیں، ایک سواری گاڑی جو دن بھر چلتی تھی اور جہاں رات ہوتی وہاں شب گزارتی، دوسری ڈاک گاڑی جو دن رات چلتی تھی، اس کا کرایہ زیادہ تھا، وقت کی بچت کے سوا اور کوئی فرق آسائش میں نہ تھا۔

منشی ممتاز علی صاحب کمبوہ کے اصرار سے اٹاوہ میں قافلہ کو رکنا پڑا، اس مبارک سفر کی شہرت بہت عام ہوگئی تھی، اس لیے ہر اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں کا ہجوم ملتا تھا، جس کی قسمت میں بیعت مقدر تھی، وہ اجازت لے کر ساتھ ہو جاتا تھا، مولاما احمد حسن کانپوری اس وقت ایسے معتقد تھے کہ گھنٹوں حضرت کے پاؤں دباتے تھے، وہ مع اہلیہ اس قافلہ میں تھے، الہ آباد سے جبل پور پہنچے تو ڈاک کی ایک گاڑی رزرو کرالی گئی اور محصول سارے قافلہ پر تقسیم کردیا گیا، اس طرح پر بمبئی تک کا کرایہ فی کس پچیس روپیہ پڑا۔

بمبئی پہنچ کر حضرت نے رحمت اللہ انبیٹھوی کے حجرہ میں جو حکیم اسماعیل کی مسجد کے مؤذن تھے قیام فرمایا۔

ریل کے سفر میں امامت اکثر حضرت گنگوہی فرماتے یا مولانا محمد یعقوب صاحب، بمبئی میں قافلہ کو ۴۴ دن ٹھہرنا پڑا، ۴۴ دن کے بعد جرمنی کا ایک جہاز بمبئی پہنچا، حاجی قاسم نے ٹھیکہ لیا اور شام ہی کو ٹکٹ فروخت کرنا شروع کردیا۔

اکثر اہل قافلہ نے تتق کا کرایہ ادا کیا اور ان حضرات نے باقی قافلہ والوں کے ساتھ چھتری کے ٹکٹ لیے، اگلے دن کشتیاں کنارہ پر آلگیں اور جدہ جانے والے سارے مسافر جہاز پر سوار ہوگئے، دوسرے دن جہاز نے عرب کا رُخ کیا اور سیٹی بجا کر روانہ ہوگیا، کپتان عیسائی تھا، مگر شریف و نیک مزاج، اس لیے مسافروں کو بڑی راحت رہی، جہاز میں بڑی لمبی صف بندی ہوکر پانچوں نمازیں باجماعت ہوتی تھیں، آٹھویں دن جہاز عدن پہنچا اور ایک رات وہاں ٹھہر کر جہاز روانہ ہوا، چوتھے دن جدہ کا بندرگاہ نظر آیا، کپتان کی درخواست پر خوشنودی اور راحت یابی کی ایک سند عربی میں لکھ کر کپتان

کو دی گئی، اس پر حضرت نے بھی دستخط کیا اس کا انگریزی ترجمہ کرا کے بھی اس کو دیا گیا۔

یلملم کے قریب پہنچ کر حضرت نے وعظ بیان کیا اور سب نے احرام باندھا، مولوی محمد احسن میرٹھی کو اس سال مطوفی ملی تھی، وہ حضرت حاجی صاحب سے اجازت لے کر جدہ آئے اور بندرگاہ پر قافلہ کا استقبال کیا، ان کو ان حضرات کی مطوفی کا شرف ملا تو دوسرے معلمین کو حسد ہوا، اس کے نتیجے میں بمشکل تمام ان کو کرایہ کے اونٹ مل سکے اور ۲؍ذیقعدہ کو جدہ سے مکہ روانگی ہوسکی۔

شبری کے اونٹ کا کرایہ چار روپیہ تھا اور شغذف کے اونٹ کا کرایہ پانچ روپیہ، جو اونٹ اول وقت چل نکلے تھے انھوں نے بحرہ میں اور باقی قافلہ نے جدہ میں قیام کیا، اگلے دن شب کے وقت مکہ معظّمہ پہنچے۔

حضرت حاجی صاحب کو پہلے سے اطلاع مل چکی تھی، اس لیے جوش محبت میں شہر سے باہر آ کر کھڑے انتظار کر رہے تھے، جب قافلہ باب مکہ پر پہنچا تو قافلہ والوں نے دیکھا کہ پٹکے سے کمر باندھے فصیل کے پاس حضرت کھڑے ہیں، شیخ کے شیدا اسی وقت سواری سے اتر پڑے اور بغل گیر ہو کر خوب دل کھول کر ملے۔ حضرت حاجی صاحب سب کو اپنی رباط میں لائے، یہ مکان اسی سال ملا تھا، صبح کو دعوت بھی آپ ہی کے دستر خوان پر ہوئی۔ قافلہ کا اکثر حصہ آخر تک اس رباط میں رہا۔

حج کا زمانہ قریب تھا، اس سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد حضرت گنگوہی قافلہ کے ہمراہ سلطانی راستہ سے مدینۃ الرسول روانہ ہوئے، ابھی شہر سے باہر ہی تھے کہ رات ہوگئی اور شہر پناہ کے دروازے بند کر دیے گئے، اس لیے مناخہ میں رات بسر کرنا پڑی، صبح کو مسجد نبوی میں نماز باجماعت ادا کی، اور صلاۃ وسلام سے فارغ ہو کر تا طلوع آفتاب مواجہہ شریف میں مراقب رہے، پھر حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت بہت مسرور ہوئے سب سے مصافحہ کیا اور سب کا حال پوچھا۔

مدینہ مقدسہ میں کم وبیش بیس دن قیام رہا، حضرت شاہ صاحب نے ملا سفر نامی ایک بخاری کو حضرت کے حوالہ کر دیا تھا، ان کے ساتھ قبا، قبلتین، وابیار سبعہ، وجبل احد ساری زیارت گاہوں پر حاضری دی۔ تقریباً بیس دن قیام کے بعد قافلہ مکہ معظّمہ واپس ہوا، پھر باطمینان ایک مہینہ سے زیادہ مکہ معظّمہ میں قیام کیا، جن لوگوں کے پاس خرچ کم رہ گیا تھا یا وطن پہنچنے کی ضرورت تھی، وہ جہاز میں واپس ہوگئے، ایک ماہ گزرنے پر بہتوں کے پاس خرچ کم رہ گیا، ناچار حضرت حاجی صاحب نے حضرت کو بھی واپسی کا مشورہ دیا۔ جدہ آ کر جو جہاز کھڑا تھا اسی کا ٹکٹ لے کر سوار ہوگئے، اور تیرہویں دن بمبئی پہنچ گئے، ۱۲۹۵ھ میں گنگوہ واپسی ہوئی، حضرت مولانا قاسم صاحب کو اسی سفر میں علالت

لاحق ہوئی، جو ۱۲۹۷ھ میں آخر جان ہی لے کر گئی۔

(تیسرا حج) حضرت گنگوہی نے ۱۲۹۹ھ میں تیسرے حج کی تیاری کی جو دوسرا حج بدل تھا، اس سفر کا تہیہ دفعۃً ہوا، اوقت اتنا تنگ ہو گیا تھا کہ حج ملنے کی لوگوں کو امید نہ تھی، چوتھی ذی قعدہ کو آپ روانہ ہوئے، اسی سال کامران میں سلطان روم (ترکی) کی طرف سے قرنطینہ قائم ہوا تھا، جو حجاج براہ عدن جائیں وہ کامران میں صحت جسمانی کے امتحان کو دس یوم خس پوش مکان میں ٹھہریں، حج میں صرف بارہ چودہ روز باقی تھے کہ ایک جہاز آیا اور ٹکٹ تقسیم ہونے لگا، حضرت نے اسی جہاز کا ٹکٹ خریدا اور اس میں سوار ہو گئے۔ جہاز نے بمبئی سے لنگر اٹھایا تو ساتویں دن سیدھا عدن پہنچا اور چند گھنٹے بندرگاہ عدن میں ٹھہر کر وہاں سے چلا تو نویں دن جدہ نظر آنے لگا۔ جہاز کے لنگر ڈالتے ہی مسافر کشتیوں پر سوار ہو گئے اور خشکی پر اترے، کسی کو خبر نہ ہوئی کہ کامران کیا شئے ہے اور کدھر واقع ہے، واپسی میں اس جہاز کو یہ سزا ملی کہ بیس دن کا قرنطینہ ہوا، اور تین ہزار روپیہ جرمانہ، جدہ سے اونٹ کا بند بست جلدی ہو گیا اور مکہ پہنچ کر اگلے دن ارکانِ حج شروع ہو گئے۔ نہایت اطمینان کے ساتھ آپ وقت پر منیٰ روانہ ہوئے۔

حجاز میں تیسری دفعہ حضرت حاجی صاحب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ اس سفر میں مفتی عنایت احمد صاحب سے ملاقات ہوئی، مفتی صاحب بقصد ہجرت بمبئی میں ٹھہرے ہوئے تھے، جب ان کو خبر ہوئی تو ملنے کے لیے آئے، حضرت گنگوہی ان سے ناواقف تھے، اس لیے انھوں نے خود ہی اپنا تعارف کرایا اور فرمایا کہ ہم نے سنا کہ آپ اہلِ علم ہیں اور شاہ ولی اللہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ملنے کو دل چاہا، غرض تھوڑی دیر بیٹھے اور چلے گئے، حضرت نے فرمایا کہ جب مفتی صاحب بوڑھے آدمی ہو کر مجھ سے ملنے کو خود تشریف لائے، تو میں کیوں نہ جاتا تا آخر دوسرے دن میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا، دیر تک باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد فرمایا کہ مفتی صاحب کو شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان سے نہایت محبت تھی، اس کے بعد فرمایا کہ مفتی صاحب اور جہاز سے گئے اور میں دوسرے جہاز میں گیا، خدا کی شان جس جہاز سے وہ گئے وہ جہاز تباہ ہو گیا اور سواریاں غرق ہو گئیں "انا للّٰہ وإنا إلیه راجعون". حضرت کا یہ آخری حج تھا۔

حضرت کی وفات ۱۳۲۳ھ میں ہوئی۔

(جاری ہے)

اسلامی کتب خانے

(دسویں قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جہنی　　ترجمہ و تلخیص: مسعود احمد الاعظمی

عہد اسلامی کے عوامی کتب خانے

تمہید:

اس قسم کے کتب خانے اسلامی مملکت کے مختلف حصوں میں شروع ہی سے پائے جاتے تھے، اور اس نوعیت کے کتب خانوں کے قیام میں مسلمانوں کو دنیا کی دوسری قوموں پر سبقت حاصل تھی۔

عرب اسلامک کلچر میں عمومی کتب خانے مشرق میں حدود چین سے لے کر مغرب میں اندلس تک عالم اسلام کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے، عالم اسلام کا شاید ہی کوئی قصبہ یا شہر عمومی کتب خانے سے خالی رہا ہو۔

عہد اسلامی کے عوامی کتب خانوں کا قصد عام طور پر تشنگان علم و معرفت کیا کرتے تھے، ان کے اندر داخلہ سے کسی کو ممانعت نہیں تھی، ان کتب خانوں میں داخلہ و مطالعہ عموماً مفت ہوا کرتا تھا، اسلامی کلچر کے کتب خانوں میں بیشتر ایسا ہوتا کہ طلبہ کو کاغذ، قلم، روشنائی اور دوسرے آلات کتابت مفت دیے جاتے تھے، اور کچھ دوسرے کتب خانوں میں تو اس سے بھی آگے بڑھ کر کھانے پینے اور دیگر اخراجات کا انتظام کیا جاتا تھا، جیسا کہ بصرہ، رام ہرمز اور موصل کے کتب خانوں میں ہوتا تھا، اور بعض کتب خانوں میں کتب بینوں کے لیے مطلوبہ کتابوں کی فراہمی کے لیے رہنمائی کرنے والے بھی ہوا کرتے تھے۔

عوامی کتب خانوں کے پھیلاؤ کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ علماء، وزراء، اور متمول افراد اپنے ذاتی کتب خانوں کو اپنی وفات کے بعد اپنے شہروں پر وقف کر دیا کرتے تھے، وقف مختلف طرح کا ہوتا تھا، حتی کہ پورا پورا کتب خانہ ہی وقف کر دیا جاتا۔ مساجد، مدارس، شفا خانے، رصد گاہیں، تکیے اور خانقاہوں پر بھی کتابیں وقف کی جاتیں۔

وقفی کتابوں کے کتب خانے:

وقفی کتابوں کے کتب خانے عالم اسلام کے اطراف واکناف میں دوسری صدی ہجری سے ہی پھیل گئے، اور یہ کتب خانے ان کتابوں کی بدولت طالب علموں کا قبلہ بن گئے، حتی کہ شاید ہی کوئی شہر ہوگا جو موقوفہ کتابوں سے خالی ہوگا۔

وقفی کتب خانوں کی کثرت تعداد اور مختلف اسلامی شہروں اور علاقوں میں ان کے پھیلاؤ پر گفتگو کرتے ہوئے یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ ان کے زمانے میں مرو میں کتب خانوں کی تعداد دس تک پہنچ چکی تھی، یہ چھٹی صدی ہجری کے اواخر اور ساتویں صدی ہجری کے اوائل کی بات ہے، کتابوں کے ان خزانوں میں سے کچھ جامع مسجدوں میں تھے اور کچھ خانقاہوں میں تھے، اور بعض مستقل عمارتوں میں تھے، یعنی وہ عام اور مفت کتب خانے تھے، اور کوئی چیز رہن رکھے بغیر ان میں سے کتابیں عاریت پر لے جائی جاتی تھیں۔ (۱)

ذاتی کتب خانوں کے ساتھ ساتھ ان عوامی کتب خانوں کا اس فکری وتہذیبی سرگرمی میں بہت مؤثر کردار تھا، جو کئی صدی تک عالم اسلام میں جاری رہی ہے، جن پر مشاہیر اہل علم نے اپنی کتابوں کی تصنیف میں اعتماد کیا ہے، جیسے یاقوت حموی مرو الشاہ جان کے کتب خانے سے اپنے استفادے کے متعلق لکھتا ہے کہ: ''اس کتاب -یعنی معجم البلدان- کے بیشتر فوائد وغیرہ جو میں نے جمع کیے ہیں، وہ ان ہی خزانوں کی مدد سے ہیں''۔ (۲)

حقیقی عوامی کتب خانوں کی ابتدا:

اہم ترین وقفی کتب خانوں اور علم کے گہواروں میں جو اس کے بعد تیسری صدی ہجری کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں ظہور پذیر ہوئے (اور جو حقیقی عوامی کتب خانوں کا نقطۂ آغاز سمجھے جاتے ہیں) حسب ذیل ہیں:

۱- دار القراء:

بعض تاریخی بیانات میں ہے کہ عبداللہ بن ام مکتوم وحضرت مصعب بن عمیر -رضی اللہ عنہما- غزوۂ بدر کے کچھ ہی بعد ہجرت کرکے مدینہ منورہ آئے، تو انھوں نے دار القراء میں نزول فرمایا (۳)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پڑھنے پڑھانے کے لیے کوئی خاص

(۱) معجم البلدان: ۳۶/۸ (۲) ایضاً: ۳۷/۸ (۳) خطط المقریزی: ۳۶۲/۲

مکان تھا، اسی کی طرف امام سیوطی - رحمۃ اللہ علیہ - نے مدارس کی ابتدا کی بحث میں اشارہ کیا ہے۔ (۱)

۲- بیت الجمحی:

سب سے پہلا عوامی کتب خانہ سمجھا جاتا ہے جو دوستوں کے لیے کھلا رہتا تھا، عبدالحکم جمحی متوفی ۷۳ھ = ۶۹۲ء نے مکہ میں ایک ادبی معاشرتی انجمن قائم کی تھی، اور اس سے ملحق ایک کتب خانہ قائم کیا تھا، اور اس میں ہر علم سے متعلق نوشتے فراہم کیے تھے، یہ پہلی صدی ہجری کے نصف اول کا واقعہ ہے، ابوالفرج اصفہانی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''عبدالحکم بن عمرو بن عبداللہ بن صفوان جمحی نے (عہد اموی میں) ایک مکان بنایا جس میں ہر علم سے متعلق نوشتے تھے، اور دیواروں میں کھونٹیاں لگائیں، جو آتا اپنے کپڑوں کو کھونٹیوں پر لٹکا دیتا، پھر کوئی نوشتہ نکال کر مطالعہ شروع کر دیتا''۔ (۲)

یہ وہ جگہ تھی جہاں ایک دفعہ مشہور شاعر احوص (متوفی مابین ۱۰۱-۱۰۵ھ) آ چکا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالحکم جمحی سب سے پہلا شخص تھا جس نے ایک عمومی کتب خانہ قائم کیا تھا، جس کے دروازے پڑھنے والوں کے لیے کھلے رہتے تھے۔

۳- بیت ابن ابی لیلی:

ان کا نام عبدالرحمٰن بن ابی لیلی تھی، ۸۵ھ = ۷۰۴ء میں وفات پائی تھی، ان کے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ: ''ایسا مکان تھا، جس میں قرآن کریم کے نسخے رہتے تھے، اس میں قراء جمع ہوتے تھے، کھانے کے علاوہ کسی اور کام کے لیے کم ہی وہاں سے جدا ہوتے تھے''۔ (۳)

۴- عبداللہ اندلسی کا مکان:

دوسری صدی ہجری کے اختتام (نویں صدی عیسوی کے شروع) میں ابوعبدالرحمٰن عبداللہ ابن محمد ہانی اندلسی نے اپنے ہاں استفادہ کے لیے آنے والے لوگوں کے واسطے ایک مکان تعمیر کر رکھا تھا، آنے والے کو اس میں ٹھہراتا، اس کے اخراجات اور کاغذ وغیرہ پر خرچ کرتا، اس کے لیے نسخے

(۱) حسن المحاضرہ: ۱۸۵/۲

(۲) الاغانی: ۵۲/۴، الاسلام والحضارة العربية: ۲/ ۱۷٦

(۳) طبقات ابن سعد: ٧٥/٦

فراہم کرتا، اس کے پاس اتنی بڑی تعداد میں کتابیں تھیں کہ بعد میں چالیس لاکھ درہم میں فروخت کی گئیں، اس رقم سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس قدر کتابیں تھیں، اس لیے کہ عام طور پر ایک کتاب کی قیمت ۲۰ درہم ہوا کرتی تھی، اور قیمتی و نفیس نسخہ کبھی کبھی سو درہم تک پہنچ جایا کرتا تھا۔

کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتب خانہ دارالعلم کا ابتدائی نمونہ اور اس فکر کا نقطۂ آغاز تھا، جو مسلم ممالک میں پھیلی ہوئی تھی، اور جس کا تقاضا تھا کہ درس و مطالعہ اہل علم و ثروت کے طبقے کی اجارہ داری بن کر نہ رہ جائے، بلکہ یہ چیز ہر شخص کی دسترس میں ہو، خواہ وہ دولت مند ہو یا نادار، آزاد ہو یا غلام۔ چنانچہ مسلمان حکمراں، وزراء، علماء، اور ادباء نے شروع ہی سے کتاب کی ضرورت محسوس کی، اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ابتدا ہی سے مطالعہ کے خواہش مند افراد کے لیے اپنے ذاتی کتب خانوں کے دروازے کھلے رکھے، اور بعد میں حقیقی عوامی کتب خانے بنا دیے، جیسا کہ صاحب بن عباد نے کیا، کہ اس نے اپنی کتابیں شہر رے کے لیے وقف کر دیں، جو آگے چل کر رے کی پبلک لائبریری کی شکل اختیار کر گئی۔

اسی طرح ابو جعفر موصلی نے چوتھی صدی ہجری میں موصل میں ایک دارالعلم تعمیر کیا، اس میں ہر علم و فن سے متعلق کتاب فراہم کر کے طلبۂ علم کے لیے وقف کر دیا، اگر علم و ادب کا طلب گار وہاں آتا تو اس میں داخل ہونے سے روکا نہیں جاتا تھا، اور اگر کوئی تنگ دست ہوتا تو اس کے لیے کاغذ اور پیسے تک اکا انتظام کرتا، جیسا کہ یاقوت حموی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (۱)

تاریخی ذرائع اور شہادتوں پر اعتماد کرتے ہوئے یہ پایا گیا ہے کہ مستقل عوامی کتب خانوں کا وقف مسلمانوں کی کتابوں اور کتب خانوں کے وقف کی سب سے قدیم قسم ہے، اور یہ کھلی ہوئی چیز ہے کہ مسلمانوں میں سب سے پہلے اس قسم کا وقف کرنے والے خلفاء، حکام، وزراء، اور اصحاب ثروت تھے، کیونکہ ان کے پاس مال و دولت کی فراوانی تھی، اور اس کار خیر کا محرک ثواب کی امید کے ساتھ اس سے استفادہ کرنے والوں کی تحسین و ستائش تھا۔

دورالعلم۔ جس سے ہماری مراد عام کتب خانے ہوتے ہیں۔ کے متعلق گفتگو محقق کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اصلی مآخذ میں ''خزائن الکتب''، ''بیوت الحکمۃ'' اور ''دورالعلم'' کے الفاظ خلط ملط ہیں۔ ان کے اندر عام کتب خانوں میں اور دوسرے میں فرق نہیں کیا گیا۔ عبداللطیف طیباوی نے زور دے کر لکھا ہے کہ ''بیت الحکمۃ'' اور ''دارالعلم'' اور اس کے علاوہ دوسرے اداروں کا

(۱) معجم الادباء: ۱۹۳/۷

(مدارس) اور (کلیات) یا اس سے ملتا جلتا نام رکھنا صحیح نہیں ہے، الا یہ کہ ان اداروں کی ہم کوئی مناسب تفسیر کریں، ان اداروں کا غالب وصف یہ تھا کہ وہ پہلے کتب خانے تھے، جہاں علماء اور طلبہ درس ومطالعہ اور تعلیم کے لیے جمع ہوتے تھے، اسی سے مکاتب کا رواج ہوا، اور نقل وترجمہ کے لیے ان سے متصل ادارے قائم ہوئے، اور ان سب کے نتیجے میں بحث وتحقیق کا دور دورہ ہوا، اس نے تربیت وتعلیم کے فروغ میں مساعدت کی، لہٰذا جو شخص کسی خاص فن میں اپنے علم ومعرفت کی تکمیل کا ارادہ کرتا، تو کتب خانے کی پناہ لیتا، یا ان سے قریب اداروں میں داخل ہو جاتا، جہاں وہ علماء کے ساتھ بیٹھ کر بحث وتحقیق کرتا، ان سے سیکھتا، ان سے علم اور اخلاق کی تعلیم حاصل کرتا، اس طرح وہاں وہ تعلیم، تربیت اور تہذیب سب ہی حاصل کرتا، جس طرح آج کے دور میں یونیورسٹی کے طلبہ تحصیل کیا کرتے ہیں۔ (۱)

ناجی معروف ''دور العلم'' سے ان عوامی کتب خانوں کو مراد لیتے ہیں جو مطالعہ اور نسخوں کے نقل اور شائقین علم کی سہولت کے لیے مدارس اور جامعات کے باہر قائم کیے گئے، اور خاص طور سے ایسے افراد کے لیے قائم کیے گئے جو کتابوں کے گراں اور کم یاب ہونے کی وجہ سے ان کے خریدنے پر قادر نہیں تھے۔ اسی لیے اغنیاء، علماء، امراء اور وزراء نے علمی اداروں کی تاسیس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور ان کے لیے ''دور العلم'' کا لفظ استعمال کیا، چنانچہ یہ درس ومطالعہ، نسخہ نویسی، اور ترجمہ وتالیف کے پبلک ادارے تھے، جو ان ذاتی ذخیروں سے مختلف تھے، جو اوپر بیان کیے جا چکے ہیں، اور دور العلم قدیم خزانوں سے مختلف تھے، اس طرح کہ یہ خزانے دور العلم کا ایک جز تھے۔ (۲)

ناجی معروف، طیباوی سے اس بات پر متفق ہیں کہ وہ کتب خانے تھے، فرق صرف یہ ہے کہ ناجی معروف کے نزدیک وہ عوامی کتب خانے تھے۔

جب کہ یوسف العش کی رائے یہ ہے کہ بڑے عوامی کتب خانے جو وقف کے لیے خاص تھے، تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں عالم وجود میں آئے، یوسف العش ان دور العلم کے بارے میں اپنی بحث کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ: ''یہ صحیح ہے کہ ان کو عوامی کتب خانہ نہیں کہا جا سکتا، مگر ہم کو یہ حق ہے کہ ہم ان کو عوامی سے مشابہ کتب خانوں کے ساتھ رکھیں، لیکن ٹھیک اسی وقت میں ابتدائی عربی اسلامی کتب خانے بھی تشکیل پا رہے تھے، جو علماء کے ایک متعین طبقے کے تصرف میں

(۱) محاضرات فی تاریخ العرب والاسلام: ۴۱-۴۲

(۲) اصالۃ الحضارۃ العربیۃ: ۴۵۷

تھے، جو حقیقی عوامی کتب خانوں کا پہلا مرحلہ تھے۔[۱]

وقفی کتب خانے:

ان اہم ترین کتب خانوں میں جواس کے بعد (تیسری صدی ہجری کے آخر اور چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں) ظہور پذیر ہوئے، اور جو عوامی کتب خانوں کے حکم میں شمار ہوتے ہیں۔ درج ذیل ہیں:

۱- موصل کا دار العلم:

اولین دار العلم میں جو قارئین کے واسطے عام کتب خانے کے طور پر معروف ہوئے، شمار کیا جاتا تھا، یہ دار العلم عراق کے شہر موصل میں قائم کیا گیا، جس کو تاریخی نصوص وشواہد پر اعتماد کرتے ہوئے، اور عصر حاضر کے عوامی کتب خانے کے ہمارے مفہوم کی اتباع میں بعض محققین نے عہد اسلامی کا پہلا عوامی دار العلم قرار دیا ہے، اس کتب خانے کو قائم کرنے کا سہرا موصل کے شافعی فقیہ اور شاعر، ابوالقاسم جعفر بن محمد بن حمدان موصلی الشحام متوفی ۳۲۳ھ = ۹۳۴ء کے سر ہے (۲)، جس کے بارے میں یاقوت حموی نے ''الفہرست'' کے مصنف محمد بن اسحاق بن الندیم کے حوالے سے لکھا ہے کہ: ''وہ -یعنی ابن حمدان- بہترین تالیف اور حیرت انگیز تصنیف کی صلاحیت والا تھا، شاعر، ادیب، فاضل، شعر وسخن کا نقاد اور کثیر الروایۃ تھا، فقہ شافعی پر ان کی متعدد کتابیں تھیں، وہ موصل کا صاحب ریاست ووجاہت تھا، فقہ، نحو، اور مناظرہ جیسے متنوع علوم میں فائق تھا، اس دور کے بڑے بڑے وزراء، ادباء، اور شعراء سے اس کے بہترین تعلقات تھے، جیسے بحتری، مبرد اور ثعلب وغیرہ''۔[۳]

ایسا لگتا ہے کہ اس کی دلچسپیوں کی گونا گونی، علم دوستی اور صدق واخلاص نے ایک ایسے کتب خانے کے قیام کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا، جس میں علم کے طلب گاروں اور سکالروں کو درس ومطالعہ اور بحث وتحقیق کے سلسلے میں امداد واعانت اور سہولیات فراہم ہوں، اور غالبًا اس کے پاس دولت کی اس قدر فراوانی تھی، جس نے اس پروجیکٹ کی تکمیل میں اس کی یاوری کی تھی، اسی کی طرف یاقوت حموی نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''حمدان موصل کے ارباب ریاست میں بہت بلند مقام کا حامل تھا، اپنے دور کے تمام وزراء کا دوست، ان کا مداح اور ان کے نزدیک بلند وبرتر تھا، اس کے شہر موصل میں اس کا ایک دار العلم تھا، جس میں ہر علم وفن کی کتابوں کا ذخیرہ تھا، جو سب طالب علموں کے

(۱) دور الکتب العربیۃ العامۃ وشبہ العامۃ: ۱۰۴
(۲) تاریخ بغداد: ۲۱۱/۷ (۳) معجم الادباء: ۱۹۱/۷

لیے وقف تھیں، کسی کو اس میں داخلے سے ممانعت نہیں تھی، اگر علم وادب کا طلب گار تنگ دست ہوتا، تو اس کو کاغذ فراہم کرتا، یہ کتب خانہ روزانہ کھلتا تھا، اور جب وہ سفر میں نہ ہوتا تو بذات خود اس میں نشست کرتا تھا، اس کے پاس لوگ آتے تو ان کو اپنے اور دوسروں کے اشعار اور تصنیفات سناتا''۔ (۱)

تاریخی ذرائع سے اس کتب خانے کی تعمیر کی صحیح تاریخ کا پتہ نہیں چلتا، لیکن احتمال یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے درمیان قائم ہوا تھا، کیونکہ وہ زمانہ جس میں ابن حمدان تھا، ۲۴۰ھ سے ۳۲۳ھ تک ہے۔

اس کتب خانے کی کتابوں کا جہاں تک سوال ہے، تو اس کے مؤسس کی دلچسپیوں کے لحاظ سے مختلف علوم پر مشتمل تھیں، جو کہ فقہ، شعر و ادب اور تاریخ و لغت سے اشتغال رکھتا تھا، دوسرے کتب خانوں سے مشابہت کے ساتھ اس کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اس میں اساتذہ و طلبہ کی رہائش کا بھی انتظام تھا۔

۲- بصرہ کا دارالعلم:

بصرہ میں دو کتب خانے قائم کیے گئے۔ پہلا عوامی تھا، جس کا تذکرہ ابن الجوزی متوفی ۵۹۷ھ=۱۲۰۰ء -رحمہ اللہ- نے ایک مختصر سے واقعے میں کیا ہے، کہ کتب خانہ اس وقت جل گیا، جب جمادی الاولیٰ ۴۸۳ھ=۱۰۹۰ء میں بصرہ جلا تھا، اس کو تلیا نجومی نے اس وقت جلایا جب بصرہ پر اعراب کا غلبہ ہوا، یہ عضدالدولہ بویہی متوفی ۳۷۲ھ=۹۸۲ء سے پہلے قائم کیا گیا تھا، اور یہ عہد اسلامی کا پہلا کتب خانہ تھا، جو وقف کیا گیا تھا۔ (۲)

ابن الجوزی نے جو لکھا ہے کہ یہ عہد اسلامی کا پہلا کتب خانہ تھا، جو وقف کیا گیا تھا، اس کی تائید ابن الاثیر رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۶۳۰ھ=۱۲۳۲ء کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ: ''جن چیزوں کو نذر آتش کیا تھا، ان میں دو کتب خانے بھی تھے، ان میں سے ایک عضدالدولہ کے وقت سے پہلے وقف کیا گیا تھا، یہ عہد اسلامی کا پہلا کتب خانہ تھا جو وقف کیا گیا تھا، اس کو عضدالدولہ نے دیکھ کر کہا تھا کہ یہ ایسا کارنامہ ہے جس میں ہم پر سبقت کی گئی ہے''۔ (۳)

اسی طرح حافظ ابن کثیر علیہ الرحمہ -۷۰۱ھ-۷۷۴ھ- نے ابن الاثیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ عہد اسلامی کا یہ بے نظیر کتب خانہ تھا، فرماتے ہیں: ''بصرہ کے لوگوں کو تلیا نامی ایک شخص نے اپنے

(۱) معجم الادباء: ۱۹۴/۷ (۲) المنتظم: ۵۴/۹ (۳) الکامل: ۱۸۴/۱

قابو میں کرلیا، یہ شخص علم نجوم میں دسترس رکھتا تھا، جس سے اس نے وہاں کے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرلیا، اور مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، اور بصرہ کی بہت سی چیزوں کو نذر آتش کردیا، جس میں مسلمانوں پر وقف کیا ہوا ایک کتب خانہ بھی تھا، عہد اسلامی میں اس کتب خانے کی کوئی نظیر نہیں تھی''[۱]۔

اس دار العلم کو عضد الدولہ بویہی کے ایک حاشیہ بردار ابو علی بن سوار نے قائم کیا تھا، معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک علم دوست شخص تھا، ابن الندیم متوفی ۳۸۵ھ = ۹۹۵ء کا معاصر تھا، مقدسی نے جغرافیہ پر اپنی کتاب احسن التقاسیم میں جس کو اس نے ۳۷۵ھ = ۹۸۵ء میں تصنیف کیا تھا، اس کتب خانے کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ: ''ابن سوار نے اس کو قائم کیا تھا، اور اس میں آنے والے اور درس ومطالعہ ونسخہ نویسی کرنے والے کے اخراجات کا انتظام کیا تھا، اس میں درس کے لیے ایک استاذ بھی مقرر تھا''۔[۲]

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتب خانے کے لیے ایک مخصوص استاذ کا بھی انتظام تھا، اور اس کا دائرہ عام کتب خانوں سے زیادہ وسیع تھا، چنانچہ اس کو موصل کے سابق الذکر کتب خانے کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے، اور بصرہ کے اسی کتب خانے کو ابن الندیم نے ''خزائن الوقف''، مقدسی نے ''دار العلم'' اور ابن الاثیر نے ''خزانۃ الکتب'' جیسے الفاظ سے تعبیر کیا ہے''۔

اغلب یہ ہے کہ یہ وہی کتب خانہ ہے، جس کو حریری متوفی ۴۴۶ھ = ۱۰۵۴ء نے اپنے دوسرے مقامہ (مقالہ حلوانیہ) میں یوں بیان کیا ہے، کہ وہ ادب آموزوں کی انجمن، اور وہاں کے باشندوں اور پردیسیوں کی بزم ہے، حریری کہتا ہے کہ میں جب پردیس سے اپنے وطن واپس ہوا، تو اس کے کتب خانے میں حاضر ہوا، جو کہ ادب آموزوں کی انجمن اور باشندوں و پردیسیوں کی بزم ہے، ایک شخص آیا اور اس نے حاضرین کو سلام کیا، اور مجلس کے آخر میں بیٹھ گیا، پھر اس نے گفتگو کا آغاز کیا، اور اپنی زبان آوری سے حاضرین کو حیرت زدہ کرنے لگا''۔

واسطی نے اس دار العلم کے ایک کلیکشن کی مقامات حریری کے تصویر شدہ نسخے سے جو پیرس کی وطنی لائبریری میں ۵۸۴۷ نمبر کے تحت محفوظ ہے، تصویر کشی کی ہے، چنانچہ بقیہ صفحہ ۳۳ پر

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۱۲/۳۶۰

(۲) احسن التقاسیم: ۴۱۳

اہل علم کے خطوط بنام حضرت محدث کبیرؒ

(مکاتیب حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

ترتیب: مسعود احمد الاعظمی

باسمہ سبحانہ

لکھنؤ - ۱۹؍محرم ۷۳ھ سہ شنبہ

حضرت مخدومی محترمی! دامت فیوضکم۔

سلام مسنون۔ میں سفر میں تھا رات ہی آیا ہوں، گرامی نامہ کے مطالعہ سے مشرف ہوا، مجھے یہاں سے علی گڈھ اور ایک دن وہاں قیام کر کے انشاء اللہ دیوبند پہنچنا ہے اس لیے راستہ کی ہمرکابی کی سعادت تو حاصل نہ ہو سکے گی، انشاء اللہ دیوبند ہی میں زیارت ہوگی، میرا بھی بہت جی چاہتا تھا اور کچھ باتیں بھی کرنی تھیں۔

دیوبند کے لیے دو ہی ٹرینیں ہیں ہاوڑہ دہلی اکسپریس جس میں دو بوگیاں سہارنپور کی بھی ہوتی ہیں یہ شاہ گنج ہو کر آتا ہے صبح ۸ بجے سے پہلے لکھنؤ پہنچ جاتا ہے اور یہیں سے سہارنپور جانے والے حضرات رات کے ۱۱ بجے پہنچتے ہیں، دوسرے میل جو لکھنؤ سے ۳ بجے دن کے بعد ملتا ہے اور رات کو ۲ بجے کے قریب سہارنپور پہنچتا ہے، دیوبند کے لیے دونوں سے میل ملتا ہے۔

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو، والسلام۔ محمد منظور نعمانی

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ - ۶۲/۱/۱۷

مخدومی محترمی! دامت فیوضکم، سلام مسنون۔

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔

جناب دیوبند تشریف نہ لے جا سکے، میں گیا تھا، بعض اہم فیصلہ طلب مسائل کے لیے

ذیقعدہ میں شوریٰ کا ایک اسپیشل اجلاس بلانا طے ہوا ہے۔

جائزہ کمیٹی بھی اپنی رپورٹ اسی اجلاس میں پیش کرے گی۔اور کوئی خاص اور اہم قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔

....

''اوجز'' کی جلد رابع کے متعلق گرامی نامہ سہارن پور پہنچ گیا تھا، مولوی نصیرالدین صاحب سے میں لے آیا ہوں اور اس کی قیمت بعد وضع کمیشن ۵۰/ ۷ ان کو ادا کر آیا ہوں، کتاب ان شاء اللہ مولانا سعیدالرحمٰن صاحب کے حوالہ کردوں گا وہ ساتھ لیتے جائیں گے۔

اتفاق سے میرا ابھی ادھر کا کوئی سفر فی الحال نہیں ہے ورنہ حاضر ہوتا، زیارت کو بہت ہی دن ہوگئے ہیں۔معلوم نہیں کہ ترمذی شریف کے کام کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا گیا یا نہیں، میرے خیال میں تو جناب کے لیے سب سے مقدم اور وسیع النفع کام وہی تھا۔

کیا جامع ترمذی کا کوئی نسخہ احمد شاکر صاحب مرحوم کی تصحیح کے ساتھ مصر سے شائع ہوا ہے؟ میرا اندازہ یہ ہے کہ ہندوستانی اڈیشنوں کا بنیادی نسخہ احمدی بھی بہت کچھ تصحیح کا محتاج ہے، اس سلسلہ میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری مرحوم نے بھی بہت کم محنت فرمائی ہے، والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفااللہ عنہ

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ-۴؍رمضان

مخدومی معظمی! دامت فیوضکم۔

سلام مسنون۔

کاپیاں مولانا نے پرسوں ہی پہنچادی تھیں۔اب صورت یہ ہے کہ شروع سے ۱۴۴ تک تصحیح ہوچکی ہے۔ (۸۱-۹۶ والی کاپی مل گئی ہے) قاری علیم صاحب نے ۱۱ صفحے اور لکھ دیے تھے، یعنی ۱۵۵ تک ۳۴ صفحے ایک دوسرے کاتب سے لکھائے گئے ہیں، اس طرح گویا ۱۸۹؍صفحے تک کتابت ہوکر میرے پاس کاپیاں آگئی ہیں، اب قاری علیم صاحب لکھ رہے ہیں، اس ہفتہ میں انشاءاللہ وہ کام ختم کردیں گے۔

میرا اندازہ یہ ہے کہ کتاب ۲۲۴ صفحے پر ختم ہوجائے گی، کاغذ پوری کتاب کے اندازہ سے ۲۰ رم خرید لیا گیا تھا، اس کاغذ میں قریباً ۷۰۰ نسخے تیار ہوسکیں گے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ پرسوں شنبہ تک وہ ساری کاپیاں دیدیں گے۔

جن کاپیوں کی تصحیح ہوچکی ہے وہ تو ترمیم بنوا کر پریس کو انشاء اللہ جلدی ہی دیدی جائے گی اور پروف کی تصحیح کے لیے میں نے مولانا عبداللطیف صاحب سے عرض کیا تھا انھوں نے منظور فرمالیا ہے۔ اب باقی کاپیوں کی تصحیح کا مسئلہ رہ جاتا ہے، ارادہ ہے کہ قاری علیم صاحب دو چار دن میں جب کام ختم کرلیں تو باقی سب کاپیاں ایک ساتھ ہی رجسٹری سے مئو بھیج دی جائیں۔

لوح کا مضمون (نام وغیرہ) لکھ کر بھیج دیا جائے، صفحات میں فہرست مضامین کے لیے بھی ایک صفحہ کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ شروع میں ۸ صفحے خالی چھوڑے گئے تھے، مولانا محمد ایوب صاحب کا مقدمہ ۶ صفحے میں آجائے گا، پہلے صفحہ پر کتاب کی لوح ہوگی اور دوسرے صفحہ پر فہرست کی جگہ نکل سکتی ہے۔ اگر ایک دو دن کے لیے تشریف لے آئیں تو سب کام آسانی سے انشاء اللہ ہوسکے گا۔ اگر دن اتوار کا ہو، تو مولانا عبداللطیف صاحب بھی فارغ ہوں گے، والسلام۔

نعمانی غفرلہ

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

از منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

لکھنؤ - ۹ستمبر ۶۲ء

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم۔

سلام مسنون۔

اس دفعہ پورا ایک ہفتہ دیوبند گزرا، جائزہ کمیٹی کا کام ختم کرنے کا عزم کرلیا تھا اور سخت محنت کرکے الحمدللہ پورا کرلیا۔ لیکن انجام کے لحاظ سے بالکل لاحاصل، بس اپنی طبیعت کو تسلی دی جاسکتی ہے کہ جو اپنے بس میں تھا اس سے دریغ نہیں کیا۔

صورت حال جناب نے جتنی مایوس کن اور تکلیف دہ سمجھی تھی اس سے کچھ زیادہ ہی تھی، لیکن

اب تو گویا مہر لگ گئی ہے، بات نوشتنی نہیں صرف گفتنی ہے۔اس کو اللہ تعالی کے تکوینی فیصلہ کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ میرا تار بعد از وقت ملنے کی وجہ سے جناب بھی تشریف نہیں لا سکے اگر آپ تشریف لے آتے تو ایک نہایت تکلیف دہ اور خطرناک فیصلہ جو صرف ایک آدمی کی کمی کی وجہ سے ہو گیا وہ نہ ہوسکتا۔ جو کچھ ہوا اس کی توجیہ اس کے سوا میں بھی کچھ نہیں کر سکا کہ شاید اللہ تعالی کو کم از کم ہمارے اس زمانے میں یہی دکھانا منظور ہے۔

حضرت شیخ الحدیث کا استعفا منظور ہو گیا اور ۴ نئے ارکان منتخب فرما لیے گئے جن کے اسماء گرامی رپورٹ سے معلوم ہی ہو جائیں گے، لیکن کارروائی کی تفصیل تو زبانی ہی عرض کی جا سکے گی، حضرت مدنیؒ کے وصال کے بعد اندازہ ہوا تھا کہ دارالعلوم میں کیا نہ رہا اور اب کے اجلاس میں دیکھا کہ اکیلے مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے نہ رہنے سے یاروں کا کیا کردار سامنے آیا ع

وائے گر پسِ امروز بُوَد فردائے

اگر طبیعت اچھی رہے تو عرض کروں گا کہ بعد برسات اکتوبر یا نومبر میں یہاں بھی تشریف لے آیئے انشاء اللہ یہاں کا چند روزہ قیام صحت وقوت کے لیے مفید ہی ہوگا، باتیں بھی تفصیل سے ہو جائے گی جن کی ایک دفعہ تو شدید ضرورت ہے تا کہ مستقبل کے بارے میں آخری طور پر سونچا جاسکے اگر چہ میں بھی قریب قریب بالکل ہی مایوس ہوں۔

مولانا محمد ایوب صاحب کی تشریف آوری تو معلوم ہوگی، شیخ عبدالفتاح نے دیوبند اور سہارنپور میں بھی آپ سے ملنے کا بڑا اشوق ظاہر کیا، اور یہاں لکھنؤ میں بھی تذکرہ کیا، یہاں تو وہ ۴ دن رہے، لیکن میں نہیں تھا، ان سے میری ملاقات پہلے مالیگاؤں اس کے بعد دیوبند وسہارنپور میں ہوئی۔

والسلام

....

باسمہ سبحانہ وتعالی

از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

لکھنؤ-۲۶ر نومبر ۶۳ء

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم، سلام مسنون۔

خدا کرے مزاج سامی اب بالکل بعافیت ہو۔ کیا عرض کروں، اپنے جی میں طے کیا تھا کہ جب تک ''الاعلام'' کی تیاری کی اطلاع نہ دے سکوں گا، عریضہ نہ لکھوں گا لیکن بدقسمتی کہ ابھی تک اس قابل نہیں ہوا ہوں۔

کل حفیظ نے ٹیلیفون سے دریافت کرنے پر بتایا تھا کہ آخری کاپی جو باقی تھی جوڑ دی گئی ہے لیکن پروف اچھا نہیں آیا پلیٹ درست کرانے کے بعد دوبارہ پروف اتروا کر کل ضرور بھجوادوں گا۔ لیکن آج اس وقت تک بھی وہ میرے پاس نہیں آیا جب کہ مغرب کا وقت قریب ہے بعد مغرب خود پریس جانے کو سوچ رہا ہوں۔

....

۳۰ رنومبر اور یکم دسمبر کو ہم لوگ بستی ہوں گے اس لیے ۲ ردسمبر کو دہرہ سے روانگی ہوسکے گی یہی طے کیا ہے اگر دہرہ زیادہ لیٹ نہ ہوا تو موٹر بس سے ۱۰ بجے کے بعد یا پھر ٹرین سے ۱۱ بجے کے بعد ۳ دسمبر کو دیوبند پہنچنا ہوگا۔ سفر حسب سابق غالباً سکنڈ ہی سے ہوگا۔ سکنڈ میں سلیپنگ والا نظام ابھی صرف لکھنؤ دہلی جانے والی شب کی ٹرین میں ہوا ہے، سہارنپور کی طرف جانے والی کسی ٹرین میں بھی یہ نظام نہیں ہے، میل میں ٹو ٹائر میں بھی اکثر برتھ آسانی سے مل جاتی ہے لیکن میل سے روانگی ہمارے لیے مشکل ہوگی، علاوہ ازیں وہ رات کو ۲ بجے سہارنپور پہنچتا ہے، اور کمزور صحت والے حضرات کے لیے وہ وقت بہت نامناسب ہے، اسی لیے دہرہ تجویز کیا ہے، اس میں پہلے سے ریزرویشن کی ضرورت نہیں۔ اس میں ٹو ٹائر میں بھی جگہ ملنے کا کافی امکان ہوتا ہے، میرا خیال یہ ہے کہ جناب مئو سے براہ راست سہارنپور کا ٹکٹ لیں اس میں کافی کفایت ہوجائے گی، چاہے جس کلاس کا لیں۔ تعلیم الدین کے جلسہ میں حاضری کی کوشش کروں گا لیکن اسفار کے تسلسل اور رفتار صحت کے پیش نظر قطعی ارادہ نہیں۔

....

جناب ۲ ردسمبر کی صبح تشریف لے آئیں ہم لوگ بستی سے انشاء اللہ ۹ بجے یک آجائیں گے افسوس مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب کا ہم نے اور ہماری جماعت نے زیادہ قدر نہ کی پہلے ان کا مرض اور اب انتقال بڑا سانحہ ہے، غفر اللہ لہ مغفرۃ لاتغادر ذنباً۔

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ - ۱۷؍دسمبر ۶۳

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم۔

سلام مسنون۔

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔ جلسہ کے آخری دن ۱۶؍دسمبر کو مئو حاضری کا میں نے پروگرام بنالیا تھا، اور خیال تھا کہ ۱۷؍کو بھی وہیں حاضر رہوں گا، لیکن ہوا یہ کہ ۳-۴-۵؍دسمبر کو دیوبند رہنا ہوا، ۶ کو سہارنپور اور پھر ۷ سے ۱۰ تک دہلی۔ وہاں سے واپسی میں ۱۱ کو چند گھنٹے سنبھل ٹھہرا، اور ۱۲ کی صبح لکھنؤ آیا۔ سفر کی آخری رات میں سردی کھانسی اور پہلے نزلہ زکام اور پھر بخار ہو گیا۔ ۱۴ تک یہ نیت رہی کہ اگر جانے کے قابل ہوسکوں تو چلا جاؤں اس لیے پہلے سے خط نہیں لکھا۔ لیکن ۱۵؍کو جب مولانا علی میاں اعظم گڈھ جانے لگے تو مولوی عتیق الرحمٰن سے معذرت کی چند سطریں لکھ کر ان کو دیدیں، کہ اگر مئو کے کوئی صاحب مل جائیں تو ان کو دیدیں، اگر ایسا ہو گیا ہوگا، تو میری معذرت جلسہ کے دوران دوشنبہ ہی کو پہنچ گئی ہوگی۔

اس وقت حاضر نہ ہوسکنے کا خاص طور سے افسوس ہے دارالعلوم کے معاملات پر کچھ گفتگو ضروری تھی، اب خدا جانے کب وقت آئے۔ اگر طبیعت ذرا بھی سفر کے قابل ہوتی تو ضرور حاضر ہوتا۔ کل صبح دوشنبہ کو بھی سوچا مگر ہمت نہ کرسکا۔

....

حفیظ نے پرسوں بتایا تھا کہ ''الاعلام'' مع ٹائٹل کے دفتری کے ہاں جاچکی، میں نے سوچا تھا کہ ۱۰-۲۰ نسخے مولانا محمد ایوب صاحب کے ساتھ جاسکیں تو چلے جائیں، لیکن پھر خود مجھے ذہول ہو گیا، موصوف غالباً کل صبح یا شام جاچکے ہوں گے انھوں نے یہی مجھ سے فرمایا تھا۔

زحمت نہ ہو تو کیفیت مزاج گرامی سے مطلع فرمایا جائے۔ دعا گو اور دعا کا محتاج وطالب ہوں، والسلام۔

محمد منظور نعمانی

برادرم مولوی رشید احمد صاحب کو سلام مسنون

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ -۲۲؍دسمبر ۶۳ء

مخدومی معظمی ! دامت فیوضکم۔

سلام مسنون۔

گرامی نامہ مورخہ ۱۹؍دسمبر موصول ہوا۔

میں نے ۱۷؍دسمبر کو ایک عریضہ لکھا تھا اور اس دن اس کے حوالہ ڈاک ہونے سے پہلے محترمی مولانا عبداللطیف صاحب سے ملاقات بھی ہوگئی تھی معلوم ہوتا ہے ۱۹؍دسمبر کو گرامی نامہ لکھنے کے وقت تک نہ میرا وہ عریضہ جناب کو ملا اور نہ مولانا عبداللطیف صاحب سے جناب کی ملاقات ہوئی۔

میں نے لکھا تھا کہ جلسہ کے موقع پر حاضری کا میرا ارادہ تھا لیکن ۲-۳ دن پہلے سے طبیعت ناساز ہوگئی اور سفر کے قابل نہیں رہا۔ جب کبھی موقع ملے گا باتیں تو زبانی ہی ہوسکیں گی۔ مولانا عبداللطیف صاحب فرماتے تھے کہ عنقریب مالیگاؤں تشریف لے جانے کا ارادہ ہے۔ مجھے ۲۹ سے ۳۱ دسمبر تک بھوپال اجتماع کے سلسلہ میں رہنا ہے اس کے بعد ممکن ہے کہ مجھے ایک دن کے لیے بھیمڑی جانا ہو، اگر یہ معلوم ہوا کہ جناب کا قیام مالیگاؤں ہے تو صرف باتیں کرنے کے لیے انشاءاللہ اتر جاؤں گا۔

''جامعۃ القرآن'' کی تفصیل زبانی ہی عرض کرسکوں گا، قاضی زین العابدین صاحب اور مولانا اکبرآبادی صاحب کی نامزدگی کے لیے ہم لوگوں کی منظوری اور تائید ضروری نہیں ہے اس سلسلہ کا تعلق صرف مہتمم صاحب سے ہے اس لیے میں نے اس سلسلہ میں جواب لکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی، والسلام۔ محمد منظور نعمانی عفااللہ عنہ

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ -۱۲؍۲؍۶۵ء

حضرت مخدومی معظمی ! دامت فیوضکم۔

سلام مسنون۔

مدت مدید کے بعد آج یہ عریضہ لکھنے کی نوبت آرہی ہے، کلکتہ کے فساد سے لے کر اب تک

قریباً یہ پورا سال ہی ایسا گزرا کہ بس جو کام سر پر سوار ہو گیا وہ کسی طرح کرلیا۔ ایک طرف مولوی عتیق الرحمٰن کی علالت نے الفرقان اور کتب خانہ کے سلسلہ کے وہ کام سر پر ڈالدیے جن سے ۷-۸ سال سے سبکدوشی رہی تھی دوسرے طرف مسلمانان ہند کے حالات نے ان کاموں میں گھسیٹ لیا جن سے کوئی مناسبت نہیں رہی تھی اور اب بھی نہیں ہے، ان سے الگ تھلگ رہنے میں اگر چہ بڑا سکون تھا لیکن کلکتہ وغیرہ کے واقعات کے بعد اپنے لیے اس کی گنجائش نظر نہیں آئی، اور ان کاموں نے وقت اور فکر کا بہت بڑا حصہ گھیر لیا، پھر اس سال میں معارف الحدیث کی تیسری جلد بھی کسی طرح لکھائی اور چھپوائی، ان سب کاموں کے بوجھ نے زندگی بالکل غیر اختیاری بنادی یہاں تک کہ دارالعلوم کی کئی مجالس میں حاضری بھی نہیں ہوسکی۔

اس لیے گزشتہ سال کی مئو کی حاضری کے بعد غالباً زیارت بھی اب تک نہیں ہوسکی ہے۔

اگلے ہفتے انشاءاللہ اعظم گڈھ حاضری ہوگی، بلکہ سوچ رہا ہوں کہ ۱۸ کی شب میں یہاں سے چل کر صبح اعظم گڈھ پہنچوں اور وہاں سے بس سے کچھ دیر کے لیے مئو حاضر خدمت ہو جاؤں۔ اگر ایسا نہ ہوسکا تو اعظم گڈھ تو انشاءاللہ زیارت ہو ہی گی۔ معارف کا نسخہ انشاءاللہ میں حاضر خدمت کروں گا دعا کا طالب ومحتاج ہوں۔

بھائی رشید احمد صاحب سلام مسنوں قبول کریں، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

محمد منظور نعمانی

مولوی عتیق الرحمٰن کی طبیعت پچھلے مہینے الحمدللہ بہتر ہوگئی تھی لیکن ادھر ہفتہ عشرہ سے پھر ضعف کا دورہ شروع ہو گیا ہے تبدیلِ آب وہوا کے خیال سے سنبھل گئے ہوئے ہیں غالباً اعظم گڈھ وہ بھی آئیں گے۔

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ-۱۱/اپریل ۶۷ء

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم، سلام مسنون۔

مدتوں کے بعد عریضہ لکھنے کی توفیق ہو رہی ہے، اس معاملہ میں عمر بھر کا مقصر ہوں، لیکن اس سے پہلے سال میں ایک دو دفعہ زیارت ہو جاتی تھی، لکھنؤ تشریف لانا بھی ہوتا رہتا تھا، لیکن اب تو

معلوم نہیں کب سے تشریف آوری نہیں ہوئی۔

اسی ہفتہ ''کتاب الزہد والرقائق'' کا نسخہ مالیگاؤں سے آیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بڑا کام لیا ہے، مالک قبول فرمائے تنہا یہی خدمت آخرت کے لیے کافی ہوسکتی ہے۔

ابھی جستہ جستہ ہی دیکھ سکا ہوں۔ انشاء اللہ پڑھ کر الفرقان میں خود ہی لکھوں گا۔

قیمت ان حضرات نے -/۳۰ لکھی ہے واقعہ میں تو نامناسب نہیں ہے لیکن ہندوستان کے غریب مولویوں کے لیے زیادہ ہی ہے اگرچہ ان میں سے بہت کم ہیں جو کم سے کم قیمت کی کتاب بھی خریدیں، چھپائی بھی بہت اچھی ہے اور کاغذ بھی ممتاز ہے۔

اللہ تعالیٰ قبول عام نصیب فرمائے اور خود قبول فرمائے۔

برادرم مولوی رشید احمد صاحب کو سلام مسنون۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

محمد منظور نعمانی

کافی عرصہ ہوا کتاب الآثار للامام محمد کی پہلی جلد آئی تھی اس کا بھی حق تھا کہ اچھی طرح دیکھ کے اس پر لکھا جائے لیکن ابھی تک مجھے موقع نہیں ملا۔ اگر بآسانی ممکن ہو تو املاءً اس پر کچھ لکھوا دیا جائے یا بطور نوٹس میرے لیے چند سطروں میں کچھ لکھا دیا جائے میں اس کی رہنمائی میں لکھ دوں، ورنہ معلوم نہیں کب تک خود پڑھنے کے لیے وقت نکال سکوں، کتابوں سے واسطہ کی نوبت اب بہت ہی کم آتی ہے۔ دوسری طرح کے کام بہت وقت لیتے ہیں، والسلام آخراً۔ محمد منظور نعمانی

کتاب الزہد تو انشاء اللہ خود اپنے لیے جلدی ہی کسی سفر میں پڑھوں گا۔

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ- یکم ذی الحجہ ۷۷ھ

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم، سلام مسنون۔

نامہ سامی نے مشرف فرمایا، الحمدللہ عافیت ہے ہاں گرمی بڑی شدید ہے، الفرقان میں جو بحث چل رہی ہے اس سلسلہ میں ابھی تک باہر کا کوئی مضمون نہیں آیا ہے، اس سلسلہ میں سیاست جیسے

کسی اخبار میں ایک دو مضمون بہت مبتذل قسم کے نکلے ان کو تو بالقصد نظر انداز کرنا مناسب سمجھا گیا لیکن ان کے علاوہ ہر مضمون کا حساب بے باق کر دیا گیا ہے صرف مولوی ابواللیث صاحب کے مضمون کا جائزہ لینا باقی ہے، آئندہ اس کی باری ہے۔

اُدھر کے سارے اخبارات ورسائل حصہ لے رہے ہیں، اِدھر کی چیزیں الفرقان کے علاوہ صرف ''مدینہ'' میں نکل رہی ہیں، اور وہ وہی ہوتی ہیں جو یہاں سے بھیجی جاتی ہیں، مولوی امین احسن صاحب کے دو خط بھی مدینہ میں شائع ہو چکے ہیں جن کی اس موضوع میں خاص اہمیت ہے، شاید نظر سے گزرے ہوں۔

میرے نزدیک اس بحث میں وزنی ہی چیزیں آنی چاہییں اگر آپ کچھ تحریر فرمائیں تو انشاء اللہ بہت مفید ہوگا۔ مدینہ نے پورا ایک صفحہ مستقل طور سے اس موضوع کے لیے دے رکھا ہے۔ اگر کوئی چیز اس سلسلہ میں ذہن میں آئے تو کسی دوسرے سے املاءً لکھوادی جائیں اور اگر دوسرے ہی کی طرف سے ہو جب بھی مضائقہ نہیں۔

۔۔۔۔۔ کے بارے میں انشاء اللہ حفیظ سے دریافت کروں گا اور جو کچھ معلوم ہوگا لکھوں گا۔ آسان حج کا نسخہ انشاء اللہ روانہ خدمت ہوگا۔ پچھلے نسخون کی قیمت بعد وضع کمیشن وہیں حساب میں جمع رکھا جائے اعیان الحجاج کے حساب میں منہا ہو جائے گی۔

نصرت الحدیث اور رکعات تراویح کے نسخے ابھی غالباً ختم نہیں ہوئے ہیں ورنہ کتب خانہ کے کارکن مجھے بتاتے، ختم ہونے پر قیمت بھی چلی جائے گی اور انشاء اللہ مزید نسخوں کے لیے آرڈر بھی، خدا کرے مزاج گرامی بخیر و عافیت ہو، والسلام۔

محمد منظور نعمانی

....

باسمہ سبحانہ وتعالی

لکھنؤ - ۸؍رجب ۹۷ھ

مخدومی معظمی! دامت فیوضکم، سلام مسنون۔

گرامی نامہ نے مشرف فرمایا، مزاج گرامی کی ناسازی کا ذکر کسی نے بستی میں بھی کیا تھا، اللہ

تعالیٰ کامل صحت وقوت عطا فرمائے۔

میں نے کل مولوی محمد ثانی صاحب سے دریافت کیا تھا کہ کاتب صاحب نے کام شروع کیا یا نہیں، ان کو معلوم نہ تھا میں نے کہلایا تھا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ وہ مجھ سے مل لیں، تاکہ میں تقاضا کردوں، اگرچہ وہ آدمی بہت معقول ہیں لیکن پھر بھی تقاضے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میری مصروفیت کا حال جناب نے جو ملاحظہ فرمایا تھا اب مصروفیت اس سے بھی زیادہ ہے اور ۲۸ ؍رجب تک یہی حال رہے گا۔ اس کے بعد سبق کا سلسلہ ختم ہوجائے گا آج ۸؍رجب ہوچکی ہے۔ اگر قاری علیم صاحب نے کوئی خبر مکمل کرلیا ہوتا تو وہ مجھے یا مولوی ثانی صاحب کو پہنچاتے، اس بنا پر اب کتاب کے رمضان تک تیار ہونے کی امید نہیں کی جاسکتی، تاہم ان کے آجانے پر میں ان سے پوری تاکید سے کہہ دوں گا اور ان سے ملاقات وگفتگو کے بعد جو اندازہ ہوگا انشاءاللہ وہ لکھوں گا۔

کاغذ کے داموں میں ان دنوں میں سنا ہے کہ کچھ کمی ہوئی ہے، وصول شدہ رقم چھ سو روپئے میں نے بھائی عبدالسلام صاحب کی دوکان پر محفوظ کرادیے ہیں۔ ابھی حافظ سمیع اللہ صاحب کو بھیجا ہے کہ اگر کاغذ کی دوکان پر ہو تو ۵۰۰ کے لیے ۳۰ رم خرید لیں پلیٹوں کے محفوظ رکھنے کے بارے میں کیا خیال ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ عندالملاقات اصرار سے عرض کروں گا کہ کتاب میں سے سخت الفاظ بالکل نکال دیے جائیں۔ اس چیز سے اچھی خاصی علمی کتاب اب بالکل بے وقعت ہوجاتی ہے۔ الفرقان میں ایک تبصرہ پڑھ کر مجھے اس کا بڑا احساس ہوا۔ اور میں اصرار کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اس نقطۂ نظر سے ضرور نظر ثانی اور ترمیم فرمادی جائے والسلام۔ نعمانی

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ - ۱۸؍رجب ۹۷ھ

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم، سلام مسنون۔

گرامی نامہ نرسوں موصول ہوگیا تھا، قاری علیم صاحب نے ابھی صرف ایک کاپی لکھ کر دی ہے، میں نے بلوایا تھا ابھی ملاقات نہیں ہوئی ہے، اب تو رمضان تک کی امید کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

....

میں تو دارالعلوم کے بارے میں بہت ہی مایوس ہوگیا ہوں، اس لیے اس دفعہ جانے کا ارادہ ہی نہیں کیا، فضول اپنا وقت اور دارالعلوم کا پیسہ صرف ہوتا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مدظلہ اگر مانع نہ ہوئے تو شوال سے مستقل معذرت کا ارادہ کر چکا ہوں، اس دفعہ بھی اس مضمون کا خط لکھ دیا تھا خدا جانے پہنچا یا نہیں اور کسی کو اس کی خبر بھی ہوئی کہ نہیں میں نے لکھا تھا کہ شوریٰ میں اس کو پڑھ دیا جائے، والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

علی میاں کا ارادہ اس مہینہ اس کتاب پر مفصل تبصرہ کا تھا معلوم نہیں اس نے عریضہ لکھا یا نہیں۔

....

حضرت مخدومی معظمی! سلام مسنون۔

دستی گرامی نامہ بر وقت موصول ہو گیا تھا، میں اس درمیان بھی اسی لائن کے ایک دوسرے کام میں سخت منہمک رہا اس لیے عریضہ نہ لکھ سکا، جو دو عبارتیں تحریر فرمائی ہیں انشاء اللہ ان سے کام لیا جائے گا۔ مزید مواد کا منتظر رہوں گا خدا کرے مزاج گرامی ہر طرح بعافیت ہو، والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۷۸ کا بقیہ

۳ر دسمبر مطابق ۹ر صفر بروز بدھ ۱۰ $\frac{1}{2}$ بجے سرپرست المآثر اور جگر گوشۂ محدث کبیر حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ کی اقتدا میں ایک جم غفیر نے نماز جنازہ ادا کر کے سپرد خاک کیا۔

ڈاکٹر صاحب صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، دولت حج سے بھی سرفراز ہو چکے تھے، کئی بار عمرہ کی بھی سعادت حاصل کی تھی، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے، اور جنۃ الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے، آمین۔

وفیات

مسعود احمد الاعظمی

ڈاکٹر نثار احمد انصاری

۸؍صفر ۱۴۳۶ھ مطابق ۲؍دسمبر ۲۰۱۴ء کو مغرب کے وقت مئو شہر کے مشہور اور ماہر و تجربہ کار معالج ڈاکٹر نثار احمد صاحب انصاری کا تقریباً پچاسی سال کی عمر میں انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر صاحب اصلاً فیض آباد کے شہر ٹانڈہ کے رہنے والے تھے، لکھنؤ کے مشہور کالج کے جی ایم سی میڈیکل کالج سے انھوں نے تعلیم حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد ہی تقریباً پچاس برس پہلے وہ مئو وارد ہوئے، اور یہاں کی خاک ان کی دامن گیر ہوگئی، ڈاکٹر صاحب جس وقت مئو آئے، یہ ایک قصبہ تھا، اور یہاں کوئی ایم بی بی ایس ڈاکٹر نہیں تھا، ڈاکٹر صاحب کو کافی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی، اور پچاس سال سے زیادہ مدت تک نہایت عزت اور ناموری کے ساتھ مریضوں کی خدمت انجام دی، اور بے شمار افراد ان کے علاج سے شفایاب ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کو حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے نہایت گہری وابستگی وعقیدت تھی، ڈاکٹر صاحب آپ کے معالج خاص تھے، ۱۹۷۶ء میں جب آپ کے اوپر قلب کا شدید دورہ پڑا تو ڈاکٹر صاحب نے نہایت حکمت اور تدبیر کے ساتھ علاج کیا، ڈاکٹر صاحب کا مکان حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر تھا، اکثر وبیشتر جب ڈاکٹر صاحب صبح میں اپنے دواخانے تشریف لے جاتے تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ کر اور بلڈ پریشر چیک کر کے جاتے، اگر کبھی کسی دوسرے ڈاکٹر نے کوئی دوا تجویز کردی تو ان کے مشورے کے بغیر اسے استعمال نہیں کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب بہت تجربہ کار تھے، مریض کے چیک اپ اور میڈیکل رپورٹ کے بغیر امراض کی صحیح تشخیص کرتے تھے، اور بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ آپ کی تشخیص غلط ثابت ہوتی ہو۔

قضا وقدر کا معاملہ بھی عجیب ہے، چند مہینوں سے تقدیر کے ہاتھوں بے بس اور صاحب فراش رہے، اور پانچ چھ مہینے کی علالت کے بعد سفر آخرت پر روانہ ہوگئے، دوسرے دن بقیہ صفحہ ۷۷ پر

قصیدۂ خطابیہ بہ شان محدث کبیرؒ

بموقع اجلاس عام بیادگار محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

مورخہ: ۲۲ر جمادی الاخریٰ ۱۴۳۴ھ..................۴ر مئی ۲۰۱۳ء بروز شنبہ بعد نماز عشاء

کاوشِ فکر و قلم، عارفؔ قصیدہ رقم:

مولانا فضل حق صاحب عارفؔ خیرآبادی اعظمی مدرسہ عربیہ منبع العلوم خیرآباد

ابو المآثر حبیب رحماں
ابو المآثر حبیب رحماں

حدیث نبوی کے وہ سلیماں ابو المآثر حبیب رحماں
وہ آشنائے رموز قرآں ابو المآثر حبیب رحماں

ابو المآثر حبیب رحماں
ابو المآثر حبیب رحماں

علوم اسلامیہ میں کامل وہ فخر دیں فخر صد افاضل
وہ اولیاء اتقیا میں شامل وہ رونقِ بزمِ علم وعرفاں

ابو المآثر حبیب رحماں
ابو المآثر حبیب رحماں

حدیث نبوی پہ حرف گیری جو منکرینِ حدیث نے کی
قلم کی حرکت علوم وہبی جو لے کے آئے وہ مرد میداں

ابو المآثر حبیب رحماں
ابو المآثر حبیب رحماں

کبھی جو بدعت نے سر اٹھایا غبار سنت پہ کچھ بھی چھایا
فضائے علمی پہ بن کے آیا وہ بادِ صرصر کا ایک طوفاں
ابو المآثر حبیب رحماں
ابو المآثر حبیب رحماں
اگر تشیع نے رنگ دکھایا علی کی تفضیل پر لبھایا
عروج شیخین کو بتایا حدیث وقرآں سے بھر کے داماں
ابو المآثر حبیب رحماں
ابو المآثر حبیب رحماں
ہے ترک تقلید جن کی عادت انہیں مسلسل ہوئی ندامت
بفیض قدرت بشان وحدت چمک اٹھا جب وہ مہرِ تاباں
ابو المآثر حبیب رحماں
ابو المآثر حبیب رحماں
بہت ہی عارفؔ ہیں ان کی باتیں تھے ان کے ساتھی قلم دواتیں
عبادتوں میں گذاری راتیں وہ باغ فردوس کے ہیں مہماں
ابو المآثر حبیب رحماں
ابو المآثر حبیب رحماں